

سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی۔ ۵

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی

مطالباتِ دین

تنظیم اسلامی پاکستان

مرکزی دفتر: ۶۷- اے علامہ اقبال روڈ کڑھی شاہو لاہور۔ فون: ۳۰۵۱۱۰

مطالباتِ دین

مشتل بہ

○ عبادت رب ○ فریضہ شہادت علی الناس
○ فریضہ اقامت دین ○

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب و تصوید

(شیخ) جمیل الرحمن

مکتبہ

انجمن خدام القرآن
25- آفیسرز کالونی ملتان فون 520451



شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون : ۵۸۶۹۵۰۱-۳

نام کتاب _____ مطالبات دین

طبع اول تا ششم (جولائی ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۸۳ء) _____ ۱۰۷۰۰

نظر ثانی کے بعد:

طبع ہفتم تا دہم (جنوری ۱۹۹۳ء تا اکتوبر ۱۹۹۹ء) _____ ۶۳۰۰

طبع یازدہم (اکتوبر ۲۰۰۲ء) _____ ۱۱۰۰

ناشر _____ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت _____ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۳۷۰۰

فون: ۰۳۔۱۰۵۸۶۹۵

شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

ن آفتاب اسلام آباد

۲۵۰۵۳۱۲۵۵۳۱

قیمت (اشاعت عام) _____ ۲۰ روپے

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَعْمَدُهُ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

ہم مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مورِ زمانہ کے سبب مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت اسلام کے اہم ترین مطالبوں اور تقاضوں سے محجوب ہوتی چلی گئی اور ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اور اسلام کو جو در حقیقت ”دین اللہ“ یعنی خدا کا نازل کردہ نظام حیات تھا، نغمائے آیتِ قرآنی اِنَّ الدِّیْنَ هِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ، محض ایک ”مذہب“ سمجھ لیا گیا اور اس کا دائرہ چند انفرادی عبادات اور معاشرتی رسوم کی ادائیگی تک محدود قرار دے لیا گیا۔ حالانکہ جب اسلام غالب نظام کی حیثیت سے قائم و نائز نہ ہو تو ہر مسلمان کی جدوجہد اور مساعی کا اصل ہدف ”اقامتِ دین“ ہونا چاہئے اور اس کے لئے محنتیں کرنا، جان و مال کھپانا اور مردھڑ کی بازی لگانا عین تقاضائے ایمان ہے اور نجاتِ اخروی کے ناگزیر لوازم و شرائط میں داخل ہے، جیسا کہ سورۃ العصر میں فرمایا گیا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِفٰی خَسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب دعوتِ رجوع الی القرآن کے لئے جنوری ۱۹۷۲ء سے ہر ماہ کراچی تشریف لانے کا سلسلہ شروع کیا جہاں ایک خطابِ جمعہ اور تین چار دروسِ قرآن حکیم کا انتظام ہوتا تھا تو اس دوران میں موصوف نے ستمبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۷۲ء میں مدینہ مسجد آرٹری میدان کراچی میں خطابِ جمعہ کے موقع پر قرآنی آیات کے حوالے سے ”دین کے مطالبات“ پیش کئے تھے۔ ان میں سے پہلا خطاب دعوتِ اسلامی کے نکتہ اول یعنی ”ہدٰی رب“ سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے خطاب کا تعلق امتِ مسلمہ کے فرضِ منصبی اور غایتِ تائیس سے تھا جس کا مناسب ترین عنوان ہے ”فریضہ شہادت علی الناس“ — اور تیسرا خطاب امتِ مسلمہ کے فرضِ منصبی کی انجام دہی کی جدوجہد سے متعلق تھا جس کے لئے جامع عنوان ہے ”فریضہ اقامتِ دین“۔

یہ تینوں خطاب اس عاجز نے ٹیپ سے نکل کر لئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر دو خطاب ”دعوتِ بندگی رب“ اور ”فریضہ شہادتِ حق“ کے ناموں سے کراچی کی ذیلی انجمن خدام القرآن کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں شائع کئے گئے تھے۔ اپریل ۷۸ء میں اس عاجز نے اللہ کا نام لے کر ان تینوں خطابات کو یک جا کر کے ”مطالباتِ دین“ کے نام سے مکتبہ تنظیم اسلامی کی جانب سے شائع کروایا جس کا دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض ہے کہ کسی تقریر اور خطاب کو ٹیپ سے نکل کرنا اور اس کے اسلوب کو تحریری شکل دینا کافی کٹھن اور مشکل کام ہے۔ صرف اللہ کے کرم اور اس کی توفیق کے سبب یہ کام انجام پا گیا۔ چونکہ یہ خطابات ڈاکٹر صاحب کی نظر ثانی کے بغیر شائع ہو رہے ہیں، لہذا ان میں زبان و انشاء اور بیان کے انداز و اسلوب میں جو کوتاہی رہ گئی ہو اس کا ذمہ اس عاجز کے کاندھوں پر ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ان کی نشاندہی ضرور فرمائیں۔ مزید برآں عرض ہے کہ ان خطابات میں آیاتِ قرآنی کے ترجمے کی بجائے عموماً ترجمانی کی گئی ہے۔ آیات کی کتابت میں صحت کا اہتمام کرنے کی بھی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ راقم الحروف کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا پورا شعور ہے، اس لئے احتمال ہے کہ احتیاط کے باوجود غلطی رہ گئی ہوں۔ اس لئے اس دعا پر اپنی معروضات ختم کرتا ہوں: رَبَّنَا لَا تَوَخُّذْنَا اِنْ نَسِينَا وَاَوْخَطُّنَا!!

احقر

جمیل الرحمن

۵ اپریل ۸۰ء

ترتیب

○ عرض ناشر _____ ۶

○ خطاب اول _____ ۷

عبادت رب

○ خطاب ثانی _____ ۳۹

فریضہ شہادت علی الناس

○ خطاب ثالث _____ ۷۱

فریضہ اقامت دین

عرض ناشر

زیر نظر کتاب ”مطالباتِ دین“ عرصہ پانچ چھ سال سے مفقود یعنی آؤٹ آف اشاک تھی۔ اس کا چھٹا ایڈیشن، جو تاحال آخری ایڈیشن تھا، مارچ ۱۹۸۳ء میں ۳۳۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا تھا، چنانچہ ۸۶ء یا ۸۷ء میں اشاک کے ختم ہو جانے کے بعد سے مکتبہ میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اس کی اشاعت کو روک لینے کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ ”فرائضِ دینی کا جامع تصور“ کے نام سے ایک مختصر کتابچہ اس دوران منصفہ شہود پر آچکا تھا جس میں اختصار کے ساتھ وہ مباحث موجود تھے جو ”مطالباتِ دین“ میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ ثانیاً ہماری خواہش یہ تھی کہ اس کتاب کی دوبارہ اشاعت سے قبل اس کے حسن ظاہری میں اضافے کے لئے اس کی کتابت دوبارہ کرائی جائے اور پوری کتاب پر بھرپور نظر ثانی کر کے اور ان مکررات و زوائد کو حذف کر کے جو دراصل تقریر کا خاصہ ہوتے ہیں، اس کے حسن معنوی کو بھی دوبالا کیا جائے۔ الحمد للہ کہ کتاب کے اس ساتویں ایڈیشن میں یہ دونوں مقصود حاصل کر لئے گئے ہیں۔ گو اس کام میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے، تاہم ع دیر آید درست آید! — ہمارے رفیق کار حافظ خالد محمود خضر نے محترم شیخ جمیل الرحمن صاحب کی رہنمائی اور ان کے مشوروں کی روشنی میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب پر نظر ثانی کر کے مناسب اصلاح کر دی ہے۔ اور کمپیوٹر کتابت سے اس کے حسن ظاہری میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے۔ آمین!

از

ناظم نشر و اشاعت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء

مطالباتِ دین

عبادتِ ربّ

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱ کی روشنی میں

ایک مسلمان سے دین کا اولین تقاضا

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا إِلٰهَكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ (البقرہ: ۲۱)

آیت کا محل و مقام

اس آیت مبارکہ پر غور و تدبیر سے پہلے ضروری ہے کہ اس مقام کو سمجھ لیا جائے جس میں یہ وارد ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں سب سے پہلی سورت 'سورة الفاتحہ' ہے اور اس کا مقام بلاشبہ تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب میں دیباچے یا مقدمے کا ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا تلقین فرمائی ہے کہ:

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○

”پروردگار! ہمیں سیدھی راہ پر چلا!“

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لَا غَيْرَ الْمَقْصُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ○

”اپنے ان بندوں کی راہ پر جن پر تیرا انعام ہوا۔ جن پر نہ تو تیرا غضب نازل

ہوا، اور نہ وہ گمراہ ہوئے!“

اس دعا پر سورة الفاتحہ کا اختتام ہوتا ہے اور اس کے بعد پورا قرآن مجید گویا کہ اس دعا کا جواب ہے کہ یہ قرآن مجید ہی دراصل وہ صراطِ مستقیم اور سواء السبیل ہے جس کی ایک بندہ مومن کو احتیاج ہے۔ یہی ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ کا انعام و اکرام ہوا۔ جو نہ گمراہ ہوئے اور نہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دعا کا مفصل جواب پورے قرآن حکیم میں بالعموم اور پہلی چار طویل مدنی سورتوں (البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ) میں بالخصوص پھیلا ہوا ہے۔

سورة الفاتحہ کے بعد سورة البقرہ شروع ہوتی ہے۔ اس سورة مبارکہ کے پہلا

دو

رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ ایک وہ جو قرآن

پڑھ

ہدایت حاصل کریں گے۔ ان کے ذکر میں وہ شرائط بیان کر دی گئی ہیں جو قرآن

مجید سے

صحیح استفادے کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر پر ضد کے ساتھ اڑ چکے ہیں اور ان کے لئے قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب ان میں طلبِ ہدایت ہی سرے سے باقی نہیں رہی ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ”خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ“ کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کی قوتِ سماعت پر سرگردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پھر دوسرے رکوع میں انسانوں کی تیسری قسم کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان پہلی دو قسموں کے بین بین ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ إِنَّا بِاللَّهِ وَإِلَهُنَّ الْأَوَّلِينَ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے، جبکہ فی الواقع وہ مومن نہیں ہیں۔ دوسرا رکوع پورے کا پورا انہی لوگوں سے متعلق تفصیلات، ان کی کیفیات اور ان کے اوصاف پر مشتمل ہے۔

قرآن کی اصل دعوت

اس کے بعد تیسرے رکوع میں قرآن مجید بنی نوعِ انسان کے سامنے اپنی اصل دعوت پیش کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
 ”اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ سکو۔“

یہ گویا کہ قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ ہے جو اس ایک آیت میں ایک جملے کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا اگر یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت کیا ہے، اس کا پیغام کیا ہے، اور وہ انسانوں کو کس بات کی طرف بلاتا ہے تو اس کے لئے یہ ایک جملہ ہی کفایت کرے گا، بشرطیکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس آیت مبارکہ کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کو وضاحت سے بیان کیا جائے۔

اس آیت مبارکہ کا آغاز ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کے الفاظ سے ہوتا ہے اور ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کلمہ

ندا ہے، جو پکارنے کے لئے اور دعوت دینے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان! اس اندازِ دعوت و مخاطب سے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید ایک دعوت کا حامل ہے، اس کے پاس ایک پیغام ہے، یہ ایک پکار کا امین ہے۔ یہ مجرد "Dogma" اور محض بے بنیاد اور بے دلیل عقائد پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے کہ اس کی طرف لوگوں کو بلایا نہ جائے اور انہیں دعوتِ عمل نہ دی جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ کسی ایک قوم، طبقے، نسل، قبیلے یا رنگ کے انسانوں یا کسی ایک ملک کے رہنے والوں کو نہیں پکارتا بلکہ رنگ و نسل اور قوم و وطن کے امتیاز کے بغیر پوری نوعِ انسانی کو پکارتا ہے۔ اس کی دعوت زمان و مکان سے بالکل آزاد ہے اور تاقیام قیامت پورا عالم انسان اس کا مخاطب ہے۔

دعوت میں آفاقیت

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں ان کی دعوت پورے عالمِ انسانی کے لئے نہیں تھی، بلکہ اپنی اپنی قوم کے لئے تھی۔ لہذا ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی قوم کو خطاب کر کے پکارا اور اسے دعوت پیش کی۔ قرآن مجید میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) کا نام بتام ذکر کر کے ان کی دعوت کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں، جن میں کلمہ خطاب "یٰقَوْمُ" ہے، یعنی "اے میری قوم کے لوگو!" حتیٰ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی، جن کی نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلقہ قبل تھی، اپنی دعوت صرف بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی۔ اس بات کی شہادت محرف شدہ اناجیل میں بھی مذکور ہے اور قرآن حکیم میں بھی آپؐ کے بارے میں "وَدَّسُوْا اِلٰی نَبِیِّ الْمُرَاتِلِ" کے صریح الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ انجیل میں آپؐ کے یہ الفاظ ملتے ہیں: "میں اسرائیل کے گمراہ کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں"۔ گویا آپؐ کی دعوت کے اصل مخاطب بنی اسرائیل تھے، پوری نوعِ انسانی نہیں تھی۔ بعد میں قلبِ مابیت ہوئی اور عیسائیت نے ایک تبلیغی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، ورنہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاً صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے تھی۔ لیکن نبی آخر الزمان حضرت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے لئے یہاں ”مُتَّقِمٌ“ کے بجائے ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان!! یہ دعوت علی الاطلاق پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔

مذہب کی دنیا سے علیحدہ ہٹ کر بھی سوچا جائے تو اس وقت دنیا میں مختلف نظریات کی حامل بے شمار دعوتیں موجود ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک دعوت بھی ایسی نہیں ہے جس میں پوری نوع انسانی کو علی الاطلاق اور بحیثیت ایک اکائی بلایا اور پکارا جاتا ہو۔ موجودہ صدی میں زیادہ سے زیادہ بڑی دعوت جو قومی و جغرافیائی سطح سے کچھ بلند ہوئی، وہ اشتراکیت کی دعوت ہے، لیکن اس میں بھی پکار یہ ہے کہ ”دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں“ متحد ہو جاؤ!“ یعنی یہ دعوت دنیا بھر کے انسانوں کے لئے نہیں ہے، بلکہ صرف کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ایک مخصوص طبقے کے لئے ہے۔ اور اس طرح ہوسنائی کو طبقات میں تقسیم کر کے ایک خاص طبقہ کی حمایت کا اعلان کیا جاتا ہے اور دوسرے طبقوں کو نہ صرف ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے، بلکہ قابلِ نفرت گردانا جاتا ہے۔ دنیا میں وہ واحد دعوت جو پوری نوع انسانی کو بغیر کسی طبقاتی فرق و تفاوت کے مخاطب کرتی ہے، اسلام اور قرآن کی دعوت ہے۔ یہی ایک ایسی دعوت ہے جس کا خطاب ہر انسان سے ہے۔ امیر اور غریب یکساں طور پر اس کے مخاطب ہیں۔ وہ خواہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں، کوئی سی زبان بولتے ہوں، کسی بھی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے حامل ہوں اور کسی دور سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ان سب کے لئے قرآن مجید میں پیغام ہے: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ!“ یعنی اس کا مخاطب کوئی خاص طبقہ، گروہ، قوم یا نسل نہیں ہے، بلکہ پوری انسانی برادری اس کی مخاطب ہے۔ لہذا صرف قرآن مجید کی دعوت ہی عالمگیر اور آفاقی حیثیت کی حامل دعوت ہے!

قرآن کی اصل دعوت۔۔۔ ”عبادتِ رب“

اب اگلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ دعوت اصل میں ہے کیا؟ قرآن مجید کا پیغام کیا ہے اور یہ کس طرف پکارتا اور کس کام کے لئے بلاتا ہے۔ اس بات کو یہاں ایک لفظ ”تَعْبُدُوا“ میں بیان فرما دیا گیا۔ یعنی عبادت کرو! بندگی اختیار کرو! غلامی اور اطاعت اختیار کرو!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

”اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں بھی پیدا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے۔ تاکہ تم بچ سکو!“

معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی دعوت کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے ”عبادت رب“ یا ”بندگی رب“۔ گویا قرآن مجید کی پوری دعوت کا خلاصہ یہی ہے کہ: ”اللہ کی بندگی اختیار کرو!“ سورہ ہود کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

الَّذِينَ كُتِبَ لَهُمُ الْحِكْمُ إِنَّهُمْ لَفِي شَرِّ دَرَجَاتٍ عِلْمًا وَعَمَلًا ۝
إِلَّا اللَّهُ إِنِّي لَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۝

”یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں (خوب جان لی گئی ہیں) پھر ان ہی کی تفصیل و شرح کی گئی ہے ایک حکمت والی اور خبردار ہستی کی طرف سے۔ (یہ کتاب جو پیغام لے کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یقیناً میں تمہارے لئے اس ہستی کی طرف سے نذیر اور بشیر بن کر آیا ہوں۔“

یعنی اگر اس دعوت سے اعراض کرو گے، اس کی خلاف ورزی کرو گے، اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت اور بندگی اختیار کرو گے اور عبادت اور بندگی میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کر لو گے تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے خبردار کرنے آیا ہوں، اس کی پکڑ سے اور اس کے جزا و سزا کے نظام سے ڈرانے آیا ہوں۔ اور اگر اسی کی عبادت کو اختیار کرو گے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لو گے اور اس کی غلامی کو اپنا شعار و وطیرہ بنا لو گے تو میں تم کو خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ تم اس کے انعام و اکرام سے سرفراز ہو گے اور جنت تمہارا ہمیشہ کے لئے مستقر بن جائے گی۔

تمام انبیاء و رسل کی مشترک دعوت

اس مقام پر اصولی بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رسل (علیم الصلوٰۃ والسلام) مبعوث فرمائے وہ یہی ”عبادت رب“ کی دعوت لے کر آئے تھے۔ یہ

بات دو اور دو چار کی طرح بالکل بدیہی ہے کہ تمام انبیاء و رسل اسی دعوتِ بندگی رب کے داعی تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہی اپنی بندگی اور عبادت مقرر فرمائی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○ (”میں نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق ہی اس لئے کی ہے کہ وہ میری عبادت کریں“)۔ لہذا یہ لازم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ، اس کے پیغامبر، اس کے نمائندے، اس کے نبی اور رسول، نوعِ انسانی کو اپنی تخلیق کی غرض و غایت کو پورا کرنے کی دعوت دیں۔ انہیں بتائیں کہ اگر انہوں نے اپنی تخلیق کا مقصد پورا نہ کیا، اس کا حق ادا نہ کیا، اپنے خالق اور رب کی بندگی اختیار نہ کی، اور اس کو مطاعِ مطلق تسلیم کر کے اپنی پوری زندگی اس کی اطاعت میں نہ دے دی تو وہ دنیا میں بھی خائب و خاسر اور ناکام رہیں گے، اس کے غضب کے مستوجب قرار پائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے حصے میں خسران و نامرادی کے سوا کچھ نہ آئے گا اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے آگ کے عذاب کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

سورۃ الاعراف، سورۃ ہود، سورۃ یونس، سورۃ الانبیاء، سورۃ الشعراء اور متحدہ کئی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء و رسل کا نام بنام ذکر فرمایا ہے اور صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ وہ ”عبادتِ رب“ کی دعوت لے کر اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود میں تو ہر رسول کی دعوت کی ابتداء کے لئے یہی کلمات نقل کئے گئے ہیں: ”يَقُومُوا لِلّٰهِ مِمَّا رَزَقَكُمْ مِنْهُ لِيُقَاتِلَ اُولَئِكَ الّٰهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ“ کہ اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ اور کوئی معبود نہیں ہے! دیگر مقامات پر انبیاء و رسل کی دعوت کے جو بنیادی نکات بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ (العنکبوت) ”اللہ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو!“۔ اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاطِيعُونَ ○ (نوح) ”کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!“ چنانچہ اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور نبی کی اطاعت کا قلابہ گردن میں ڈالنے کی دعوت ہی پر نبی کی مرکزی دعوت رہی ہے۔

”عبادت“۔ قرآن حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ ”عبادت رب“ قرآن مجید کی بڑی ہی بنیادی اور مرکزی اصطلاح ہے اور پورے قرآن حکیم کی دعوت کا خلاصہ اسی ایک لفظ ”عبادت“ میں پنہاں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی دعوت کا فہم اسی لفظ ”عبادت“ کے صحیح فہم پر منحصر ہے اور اسی سے تمام انبیاء و رسل کی اس متفقہ دعوت کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے اپنے ادوار میں اپنی قوموں کو بلاتے رہے اور جسے پورے عالم انسانی کے لئے خاتم النبیین والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے۔ عبادت رب کی اہمیت کو سمجھنے اور اس کے مفہوم کی وضاحت کے لئے قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البینہ کی آیت ۵ کا مطالعہ فرمائیے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝

”اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کو صرف اس کے لئے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی (طرز عمل) نہایت صحیح و درست دین (نظام زندگی) ہے۔“

اس آیت مبارکہ کے مطالب و مفاہیم کے ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ آپ دو باتیں نوٹ فرمائیں۔ پہلی بات تو اس سورۃ مبارکہ کا نام ہے جس میں یہ آیت وارد ہوئی۔ اور دوسری بات وہ سلسلۂ کلام ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ کا نام ”البینہ“ ہے جس کے معنی ہیں ”روشن اور واضح دلیل“۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سورۃ مبارکہ کے مضامین روزِ روشن کی طرح عیاں اور سورج کی طرح تابناک ہیں۔ جس طرح ”آفتاب آمد دلیلِ آفتاب“ کے مصداق سورج کے وجود کے لئے کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں، اسی طرح اس سورۃ کے مضامین خود اپنے مطالب و مفاہیم ادا کرنے کے لئے کافی و شافی ہیں۔ پچھلی آیات سے اس آیت مبارکہ کا ربط و تعلق یہ ہے کہ اہل کتاب

اور مشرکین اپنے کفر و ضلالت میں اتنے آگے نکل گئے تھے کہ اب ان کا خود اپنے محرف صحیفوں سے اور خود اپنی عقل سے راہ ہدایت پالینا ممکن نہ تھا۔ لہذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسولؐ ان کے پاس دلیل روشن اور پاکیزہ صحیفے کے ساتھ بھیجا جائے، جو ان کے سامنے پچھلی تمام کتب صادقہ کی اصل دعوت کو از سر نو پیش کرے، انہیں آیات الہی کی تلاوت کر کے سنائے اور کفر و شرک کی ہر صورت کو غلط اور خلاف حق ہونا ان کو سمجھائے۔ سورہ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں اس اسلوب بیان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت بیان فرمائی گئی۔ پھر اس بات کو کھولا گیا کہ ان اہل کتاب کی تفرقہ بازی اس لئے نہیں تھی کہ ان تک صحیح علم نہیں پہنچا تھا، بلکہ دلیل روشن آجانے کے بعد ان کا یہ تفرقہ، ان کا حق سے اعراض اور ان کی بد اعمالیاں محض ہوائے نفس کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کا ہر نبی اور رسول عبادت رب کی دعوت لے کر آیا تھا اور آیا کرتا ہے۔ اور انہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر اپنی اطاعت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی دراصل دین قیم ہے!

غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا علیحدہ حکم ہے اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا علیحدہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان فرض عبادات سے علیحدہ ایک ”عبادت“ انسان سے مطلوب ہے۔ اس عبادت کو ”لِتَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ“ کے الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ عبادت اس رویہ اور طرزِ عمل کا نام ہے کہ انسان یکسو ہو کر اپنی پوری زندگی کو مخلصانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے۔ اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اور ہر زاویہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہو۔ نظامِ اخلاق، نظامِ معیشت، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست، نظامِ عدل، نظامِ صلح و جنگ اور نظامِ حکومت، غرضیکہ پورا نظامِ زندگی اس ضابطہ اور اس ہدایت کے تحت استوار ہو جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کے توسط سے بنی نوعِ انسان کی فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اخروی کے لئے عطا فرماتا ہے۔ البتہ جہاں تک اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور دوسری فرض عبادات کا اس عبادتِ رب سے تعلق کا معاملہ ہے وہ ان شاء اللہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

”عبادت“ کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے لفظ ”عبادت“ کسی کے سامنے مطیع و منقاد ہو جانے کے لئے آتا ہے۔ اس کا مفہوم کسی کے سامنے جھک جانا، پست ہو جانا اور بالکل بچھ جانا ہے۔ اسی لئے عربی میں ”لَطَرْتُ الْمَعْبُودَ“ اس راستے کو کہتے ہیں جو مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے خوب پائمال ہو کر بالکل ہموار ہو گیا ہو اور اس میں کوئی اونچائی نیچائی نہ رہی ہو۔ اسی طرح اگر کسی جانور کو خوب سدھا لیا جائے اور اس کی تربیت اس طور سے ہو جائے کہ وہ اپنے مالک کا ہر حکم ماننے لگے، محض اشارے یا لگام کی ذرا سی حرکت سے وہ سمجھ لے کہ میرا مالک کیا چاہتا ہے، مجھے کدھر مڑنا چاہئے، مجھے اپنی رفتار تیز کرنی چاہئے یا ہلکی رکھنی چاہئے تو اس کے لئے بھی عربی میں یہی لفظ ”مُعَبَّدٌ“ مستعمل ہے۔ چنانچہ ”الْبَعِيدُ الْمُعَبَّدُ“ اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے خوب سدھا لیا گیا ہو اور جو پورے طور پر اپنے مالک کا مطیع ہو کر اس کے اشاروں پر حرکت کرنے لگا ہو۔ ابو حیان اندلسی نے ”عبادت“ کے ان تمام مفہیم کا استقصاء کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ”لَعِبْدَةُ اَلْتَّنَزُّلِ۔ فَلَمَّا اَلْجَمَعُهُوْدُ۔“ یعنی اس پر تقریباً اجماع ہے کہ عبادت کا اصل مفہوم ”تذلل“ یعنی کسی کے سامنے پست ہو جانا، کسی کے سامنے جھک جانا، یا کسی کے سامنے بچھ جانا ہے۔ ہماری اردو زبان کے لحاظ سے ”بچھ جانا“ اصل مفہوم سے قریب ترین ہو گا۔ چنانچہ کسی کا مطیع فرمان ہو جانا اور خود کو اس کے سامنے بچھا دینا اصل میں عبادت ہے۔

بعض اوقات کسی کی اطاعت مجبوری کے تحت اور اپنی مرضی کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اطاعت پر بھی اس لفظ عبادت کا اطلاق ہو گا۔ چنانچہ قرآن مجید نے مصر میں بنی اسرائیل کی محکومی اور اطاعت کی جو کیفیت بیان کی ہے کہ فرعون اور قبطیوں نے ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، وہ ان پر حکمران ہو گئے تھے اور ان کو اپنا مملوک سمجھنے لگے تھے، اس مفہوم کی تعبیر کے لئے یہی لفظ ”عبادت“ استعمال کیا ہے۔ سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے جو انہوں نے فرعون سے مخاطب ہو کر کہا تھا: ”فَإِنِّي عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَآئِيلَ“ کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور محکوم بنا لیا ہے، اپنا مطیع کر لیا ہے، تو خود کو ان کا مالک سمجھ بیٹھا ہے! اور پھر یہی لفظ ایک موقع پر خود فرعون نے بھی استعمال کیا۔ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) نے فرعون کے

دربار میں پہنچ کر اس کو بدگئی رب کی دعوت دی تو اس نے بڑے طنز اور استحقار کے انداز میں کہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں دعوت دینے، تبلیغ کرنے اور نصیحت کرنے چلے آئے ہیں، در آنحالیکنہ ”وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَدُوٌّ“ اور یہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو ہماری محکوم قوم ہے، جو ہماری مطیع اور غلام ہے، جس پر ہمیں کُلی اختیار حاصل ہے۔ لہذا لغوی اعتبار سے عبادت کا لفظ بجز اطاعت کے لئے بھی آتا ہے، چاہے اس میں اطاعت کرنے والے کی اپنی مرضی اور خواہش کا دخل نہ ہو۔

”عبادت“ کا اصطلاحی مفہوم

یہی لفظ ”عبادت“ جب اپنی لغوی اصل سے اٹھ کر ہمارے دین کی ایک اصطلاح بنا ہے تو ”اطاعت“ کے ساتھ ساتھ اس میں ایک دوسرا جزو لائاً شامل ہو جاتا ہے اور وہ ہے ”محبت اور شوق کا جذبہ“۔ لہذا عبادت کا حقیقی مفہوم یہ ہو گا کہ شوق اور محبت کے جذبے کے ساتھ کسی کے سامنے اپنے آپ کو بجا دینا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس لفظ کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

”لفظ العبودیۃ يتضمن کمال الذل و کمال الحب“

یعنی اس لفظ عبودیت میں دو چیزیں لازمی طور پر شامل ہیں۔ ایک طرف تو ”کمال ذل“ ہو۔ انسان نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ کے سامنے بجا دیا ہو، گرا دیا ہو، پست کر دیا ہو، اور وہ خود اپنی مرضی سے اللہ کی مرضی کے حق میں دست بردار ہو گیا ہو۔ اور دوسری طرف اس کا جزو لازم ”کمال حب“ ہے، کہ اللہ کے سامنے یہ جھکتا اور یہ اطاعت و تسلیم کمال محبت و شوق اور دل کی پوری آمادگی اور رغبت کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی مجبور ہو کر اطاعت کر رہا ہو تو یہ اصل میں روح عبادت سے خالی ہوگی۔ امام ابن قیمؒ نے اسے ان الفاظ میں مزید واضح کیا ہے:

”العبادة تجمع اصلین : غاية الحب مع غاية الذل والخضوع“

یعنی عبادت میں دو چیزیں لائاً شامل ہوں گی، اور وہ یہ کہ ایک طرف انتہائی درجے کی محبت، شوق، رغبت اور دل کی آمادگی ہو، اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ غایت درجے کا تذلل اور خضوع بھی موجود ہو۔ چنانچہ ان کے نزدیک کمال محبت و شوق اور

رغبت کے ساتھ اللہ کے آگے خود کو بچا دینا اور پست کر دینا ہی اصل روحِ عبادت ہے۔ عبادت کا یہ اصطلاحی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب قرآن مجید کی دعوتِ عبادت پر دوبارہ توجہ مرکوز کیجئے۔ ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ لِنُكَرِّهَ“ ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ لِنُكَرِّهَ“ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے انسانو! اے بنی نوع آدم! جھک جاؤ، پست ہو جاؤ، اپنے آپ کو بچا دو۔ کمالِ محبت اور کمالِ شوق و رغبت کے ساتھ۔ اس ہستی کے سامنے جو تمہارا رب ہے۔ اور وہی تمہارا خالق اور پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یعنی تمہارا پالنے والا وہی ہے جو تمہارا موجد ہے۔ جس نے تم کو وجود بخشا ہے، وہی اس وجود کی تمام ضروریات فراہم کرنے والا اور اس کی کفالت کرنے والا ہے۔

”عبادت“ کا محدود تصور

عبادت کے اس حقیقی مفہوم کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ ہمارے ہاں اس لفظِ عبادت کا حلیہ کس طرح بگڑا ہے۔ ہمارے ہاں وہی تصورات جس طرح محدود اور بعض حلقوں میں جس قدر مسخ ہوئے ہیں، اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے ”عبادت“ کو صرف چند اعمال اور مراسمِ عبادت کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے اور بس ان ہی کی ادائیگی پر عبادت کو منحصر سمجھ لیا ہے، جبکہ بقیہ زندگی اس سے بالکل خالی ہے۔ ہمارے عوام الناس کے ذہنوں میں عبادت کا یہ تصور صدیوں کے انحطاط کے بعد رائج ہو گیا ہے کہ بس نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی عبادت کے زمرے میں آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سب عبادات ہیں، لیکن جب عبادت کو انہی میں منحصر کر لیا جائے گا اور یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا تو تصور دین محدود (Limited) ہی نہیں، مسخ (Perverted) ہو جائے گا۔ اور یہ تصور اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوگا جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے۔ عبادت اس طرزِ عمل کا نام ہے کہ کمالِ محبت و شوق اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے اور ہر گوشے کو اللہ کے حکم کا مطیع بنا دینا اور اپنی آزادی، اپنی خود مختاری، اپنی مرضی، اپنی چاہت، اور اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ کی مرضی اور رضا کا تابع بنا دینا، زندگی کے تمام افعال و اعمال میں ”سر تسلیم خم ہے۔۔۔۔۔“ کا رویہ

اختیار کرنا اور پوری زندگی کا اس رخ پر ڈھل جانا ہی عبادت ہے۔ عبادت نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ میں محدود و منحصر نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا، یہ وہ اعمال ہیں جو پوری زندگی کو خدا کی بندگی اور غلامی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتے ہیں اور حقیقی عبادت کی ادائیگی میں اس کے مدد و معاون بنتے ہیں۔ ان کے ذریعے انسان میں وہ قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس روش کو اختیار کر سکے جس کا نام ”عبادت“ ہے۔

ایک وسیع تر لیکن ناقص تصور عبادت

خوش قسمتی سے اس دور میں عبادت کا ایک وسیع تر تصور پیدا ہوا ہے اور بہت سے اہل قلم حضرات کی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجے میں اب یہ بات پڑھے لکھے طبقے کی اچھی خاصی تعداد کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ عبادت پوری زندگی میں کامل اطاعت کا نام ہے، اور پوری زندگی میں خدا کے حکم کو ماننا اور زندگی کے تمام گوشوں میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنا عبادت کا تقاضا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس طبقہ کے تصورِ عبادت کے اندر بھی ایک محدودیت موجود ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہاں عبادت کے ایک جزو یعنی کامل اطاعت پر تو پورا زور (Emphasis) موجود ہے، لیکن اس کی روح حقیقی یعنی کمالِ شوق، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاتی محبت کا تعلق، کمالِ رغبت اور دل کی پوری آمادگی جیسی ارفع و اعلیٰ منازل نگاہوں سے اوچھل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی اس روح حقیقی کے بغیر محض اطاعت کو اگر پوری زندگی پر بھی پھیلا دیا گیا ہو تو بھی عبادت کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کے لئے کامل اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ کے ساتھ انس، دل لگاؤ اور شوق و رغبت بھی لازمی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام میرا قیام بھی حجاب میرا سجدہ بھی حجاب!

عبادت کے اس مفہوم کو ماہر القادری مرحوم نے ان الفاظ میں شعر کا جامہ پہنایا ہے۔

جو سجدے میں دل بھی جھکے گا نہ ماہر

وہ کچھ اور شے ہے، عبادت نہ ہوگی!

(مرتب)

عبادت کی روح حقیقی : محبت الہی

عبادت کی روح حقیقی محبت خداوندی کو قرآن حکیم میں بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اسے ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

”اور جو لوگ ایمان لائے، وہ سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں“

اس آیت کے پہلے حصے میں فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ

”اور لوگوں میں بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو اس کا ترمقابل بنا لیا ہے۔ اور وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کئی چاہئے۔“

”يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ“ میں کاف (ک) حرف تشبیہ ہے۔ اسے ذہن میں رکھ کر اگر ہم اپنی اصل کیفیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ تو اس سے بھی بدتر ہے، کیونکہ ہم نے خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں اور نظریات و خیالات کو خدا جیسا ہی نہیں بلکہ خدا سے بھی زیادہ محبوب بنا لیا ہے، ہم نے خدا کی محبت کو مؤخر کر دیا ہے اور دنیا کی محبت عملی طور پر ہمارے لئے مقدم ہو گئی ہے۔ ہم نے علاقہ دنیوی کی محبت کو اللہ کی محبت پر غالب کر دیا ہے۔ ہماری کیفیت تو وہ ہے جو سورۃ التوبہ کی ایک آیت ۲۴ میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دینے کی وعید سنائی ہے۔ آیہ مبارکہ کے الفاظ ہیں:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ○

”(اے نبی! ان سے صاف صاف) کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے ماں باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے رشتہ دار، اپنے وہ مال جو تم نے (بڑی محنتوں سے) جمع کئے ہیں، اپنے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو

خدا ہے اور اپنے وہ مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں، اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر منتظر رہو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

تو اس آیت مبارکہ میں فی الواقع ہمارا نقشہ اور ہماری تصویر موجود ہے۔ سورۃ الانبیاء میں قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا گیا: ”قُلْ ذِکْرُکُمْ“ کہ اس قرآن میں تمہارا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ ہر شخص قرآن کے اس ابدی و دائمی آئینہ میں اپنی سیرت کے خدوخال کو نمایاں طور پر دیکھ سکتا ہے۔ ”قُلْ ذِکْرُکُمْ“ کے الفاظ میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ ہماری تمام صلاحیتوں اور ہماری ساری دوڑ و دوپ کی نقشہ کشی اس کتابِ مبین میں کر دی گئی ہے۔ تو اصلاً ہمارا حال یہ ہے جو اس آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا۔ حالانکہ اہل ایمان کا حال تو وہ ہونا چاہئے جو سورۃ البقرہ کی اس آیت میں بیان ہوا جس کا حوالہ میں نے ابھی دیا ہے کہ: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا فَتَدُ حُبًّا لِلَّهِ“ یعنی جو لوگ واقعہ ایمان سے بہرہ ور ہیں، جنہیں ایمان سے حصہ مل گیا ہے، جنہیں ایمان کی حلاوت حاصل ہو گئی ہے، ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں انتہائی شدید اور سخت ہیں۔ ان کی زندگی میں اللہ کی محبت ہر چیز کی محبت پر غالب آگئی ہے۔ تمام علاقہ دنیوی کی محبت نیچے ہے اور اللہ کی محبت اس پر غالب ہے۔ تو اللہ کی محبت ایمان کے لوازم میں سے ہے۔ بلکہ صرف اللہ ہی کی نہیں، اللہ کے رسول کی محبت بھی جب تک تمام علاقہ دنیوی پر غالب نہ ہو جائے تب تک ایمان صحیح نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ

اجمعین

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے والدین سے، اپنی اولاد سے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔“

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں محبتِ خداوندی اور محبتِ رسول کا مقام و مرتبہ اور ”عبادتِ رب“ کا حقیقی مفہوم آپ پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ”عبادتِ رب“ کے حقیقی تصور کو عام کیا جائے۔ جن حضرات کے ذہنوں میں یہ تصور واضح ہو جائے وہ اسے مزید آگے پھیلائیں اور عوام الناس کو آگاہ کریں کہ عبادت سے محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ مراد لے لینا اور باقی زندگی کو اس سے خارج سمجھنا عبادت کا بڑا ہی غلط تصور ہے۔ عبادت تو اصلاً یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں بسر ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے آزاد نہ رہے۔ نہ صرف یہ کہ ہماری گھر کی زندگی اور بازار کی زندگی اللہ کی کامل اطاعت کا نمونہ نظر آئے، بلکہ قومی اور ریاستی سطح کے تمام ادارے اور حکومت کے تمام شعبے جب تک قانونِ خداوندی کے پابند نہ ہو جائیں، اس وقت تک عبادت کا حقیقی تقاضا ادا نہیں ہوتا اور ”فَخَلُّوا لِي السِّلْمَ كَلِمَةً“ (”اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“) کے قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔۔۔ اس کے بعد اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مجددِ اطاعت نہیں، بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہے جو اپنے ساتھ محبت کی چاشنی لئے ہوئے ہو، جس کے اندر دل کی گھلاوٹ شامل ہو، جس میں خدا کے ساتھ ایک ذاتی تعلق اور ذاتی محبت کا رشتہ موجود ہو۔ انسان اگر مجبور ہو کر کسی کا مطیع ہو جائے یا اضطراری طور پر کسی کی محکومی قبول کر لے تو یہ صورتِ اطاعت تو کھلائے گی لیکن عبادت نہیں کھلائے گی۔ عبادت کا تقاضا اسی وقت پورا ہوگا جب اطاعت کے ساتھ انتہائی محبت، انتہائی شوق، انتہائی رغبت اور دل کی پوری آمادگی شامل ہوگی۔ اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی اصل روحِ دین ہے، اور بد قسمتی سے اسی کی کمی ہے ان مساعی اور کوششوں میں جو ہمارے ملک میں یا چند دوسرے اسلامی ممالک میں دینِ اسلام کے احیاء اور اس کی نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کے لئے ہو رہی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عصرِ حاضر میں ہمارے ہاں افکار و نظریات کی ایک تعمیرِ نو ہو رہی ہے، اور دینی تصورات کسی حد تک دوبارہ اپنی اصل حقیقت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ہم جب زوال پذیر ہوئے تو ہستی کی انتہا کو پہنچے، یہاں تک کہ ہمارے دینی تصورات بھی مسخ ہوئے۔ لیکن رفتہ رفتہ تعمیرِ نو ہو رہی ہے اور بہر حال یہ بات انتہائی قابلِ تعریف اور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد پر یہ بات واضح

ہو چکی ہے کہ عبادت کا اصل مفہوم پوری زندگی میں خدا کی اطاعت کا نام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اصل کام یعنی روح دین کی تجدید اور اس کا احیاء ابھی باقی ہے۔ روح دین اصل میں نام ہے اللہ کے ساتھ ایک ذاتی تعلق، ذاتی محبت اور ذاتی انس کا۔ جب تک دل میں اللہ کی ذات کا کامل یقین اور اس کے ساتھ قلبی محبت کا تعلق نہیں ہوتا، اور اس یقین اور محبت کے نتیجے میں اللہ کی ذات محبوب ترین نہیں ہو جاتی، اس وقت تک گویا اصل روح دین موجود نہیں ہے۔ گویا بس ایک ڈھانچہ ہے جو کھڑا ہو گیا ہے، جس کے اندر ابھی روح نہیں پھونکی گئی۔ اور اطاعت کئی اسی وقت عبادت قرار پائے گی، جب اس کے اندر ذاتی محبت کا عنصر شامل ہو گا۔

محدود تصور عبادت کا افسوسناک نتیجہ

عبادت کا تصور محدود ہونے ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ روح دین نگاہوں سے اوچھل ہو گئی، نتیجہ ساری توجہ ڈھانچے ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اور اب اس ڈھانچے کی اہمیت اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ذرا ذرا سے فرق سے مستقل گروہ بنائیاں ہو گئیں، مختلف مسلک بن گئے اور مستقل طور پر طے ہو گیا کہ یہ مسجد فلاں مسلک والوں کی ہے اور وہ فلاں مسلک والوں کی ہے۔ اور اختلاف یا فرق کیا ہے؟ مجرد یہ کہ کسی نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور کسی نے ذرا نیچے، کسی نے آئین زور سے کسی اور کسی نے آہستہ، کسی نے رفع یدین کیا اور کسی نے نہیں کیا۔ حالانکہ دین میں ان سب کی اجازت موجود ہے، لیکن ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ان چیزوں کی بنیاد پر ”من دیکرم تو دیکری“ کی نوبت آ جاتی ہے۔ دین میں جن چیزوں کی حیثیت فروعی اور ثانوی، بلکہ اس سے بھی کمتر ہے، ان کو مقدم ترین سمجھ لیا گیا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ یہی کہ اصل روح دین سامنے نہیں ہے۔ یہ تو یاد ہی نہیں کہ نماز کی اصل روح ”لَسْتَ حَاضِرٌ لِّلَّهِ فِي الْقَلْبِ“ یعنی دل میں اللہ کی یاد ہے، اس کی اصل جان خشوع اور خضوع یعنی عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جانا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المؤمنون کے آغاز میں فرمایا گیا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝

”بلاشبہ فلاح پا گئے وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے

ہیں۔“

تو جب تک یہ خشوع موجود نہ ہو اس وقت تک نماز کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ع ”عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہ تصورات“ کے مصداق اگر خدا کی محبت ذاتی قلب میں موجود نہ ہو تو سارے قوانین اور ضابطے محض ایک بے روح ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

عبادت کی ضد : استکبار

اب تک کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ عبادت اصل میں اللہ کے حضور تذلّٰل، عاجزی، جھک جانے، پست ہو جانے اور بچھ جانے کا نام ہے۔ اور اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ یہ زندگی کے کسی ایک گوشے میں محدود نہ ہو، بلکہ پوری زندگی پر محیط ہو۔ اس بات کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لئے سورۃ المؤمن کی اس آیت مبارکہ پر توجہ فرمائیے، جس میں ”عبادت“ کے متضاد کے طور پر لفظ ”استکبار“ وارد ہوا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ○

”اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی اور سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“

معلوم ہوا کہ عبادت کا تقابل اور اس کی ضد (Antonym) استکبار، گھمنڈ، سرتابی، سرکشی، خود رائی اور اپنی مرضی پر چلنا ہے۔ اور عربی مقولہ ”تَعْرِفُ الْأَشْيَاءَ بِمَضَادِّهَا“ کے مصداق عبادت کی حقیقت ان الفاظ کے ذریعے سمجھی جاسکتی ہے جو اس کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی عبادت کی ضد یہ طرز عمل ہے کہ خدا کی مرضی کے مقابلے میں اپنی مرضی اور خدا کے حکم کے مقابلے میں اپنے نفس کے حکم کو ترجیح دی جائے۔ اس طرز عمل کو قرآن حکیم میں اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنالینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوَاهُ

”کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟“

ایسا شخص گویا خدا کے بجائے اپنے نفس کی عبادت کر رہا ہے۔ خدا کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی خواہش نفس کی پیروی یا زمانے کے چلن اور معاشرے کے رسم و رواج کی تقلید کرنا درحقیقت عبادت کی ضد ہے۔

عبادت کی شرط لازم : اخلاص

عبادت کے ضمن میں قرآن حکیم میں یہ مضمون بھی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ عبادت خالصۃً اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ چنانچہ سورۃ الزمر میں فرمایا:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتُعْبَدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ

”(اے نبی!) ہم نے حق کے ساتھ اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے، پس آپ اللہ کی بندگی کیجئے، پوری اطاعت اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے! یاد رکھو کہ خالص اطاعت بس اللہ ہی کے لئے ہے۔“

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا:

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝

”(اے نبی!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ ساری اطاعت صرف اسی کے لئے خالص ہو جائے۔“

اور جیسا کہ میں پوری تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ دین کی رو سے اس اطاعت و فرمانبرداری میں شوق و محبت، حبی کی رغبت اور دل کی پوری آمادگی شرط لازم ہے۔ تذلل اور محبت دونوں مل کر عبادت کا تقاضا پورا کرتی ہیں۔ خدا کی اطاعت اس طرز کی اطاعت نہیں ہے کہ جیسے کسی جابر اور قاہر کی اطاعت طوعاً و کرباً کی جاتی ہے، بلکہ یہ اطاعت انتہائی مشفق اور ودود ہستی کی اطاعت ہے۔ یہ الرحمن اور الرحیم کی اطاعت ہے، الرؤف اور الکرم کی اطاعت ہے، جو ہم سے بڑھ کر ہمارا خیر خواہ ہے۔ ہم اپنے آپ سے وہ محبت نہیں کر سکتے جو محبت وہ ہم سے کرتا ہے۔ ہم اپنے خیر اور شر کو نہیں جانتے اور اس میں تمیز نہیں کر سکتے، لیکن وہ اسے خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ ہم اپنی مصلحتوں سے آگاہ نہیں، لیکن وہ جانتا ہے کہ کس چیز اور کس کام میں ہماری مصلحت ہے۔ اس تصور

اور شعور کے ساتھ خدا کے سامنے بچھ جانا اور اپنی پوری زندگی کو بطیب خاطر اس کے قانون کی پابندی اور اطاعت میں دے دینا۔۔۔۔۔ یہ ہوگی وہ اطاعت جسے قرآن حکیم ”عبادت“ سے تعبیر کرتا ہے اور بنی نوع انسان کو جس کی دعوت دیتا ہے۔ اور جو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق و ربوبیت

آیہ مبارکہ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَيُّ الْقَيُّومُ الَّذِي خَلَقَكُمْ**۔۔۔۔۔ میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس کا رب ہونا اور دوسرے اس کا خالق ہونا۔ درحقیقت یہ دو صفات ہی دعوتِ عبادتِ رب کی دلیلیں ہیں۔ یعنی وہی تمہارا خالق، تمہیں وجود بخشنے والا ہے اور وہی تمہارا پروردگار اور پالنے والا بھی ہے، لہذا صرف اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ انسان نہ تو آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی وہ خود اپنا خالق ہے۔ سورۃ المور میں فرمایا گیا:

”لَمْ يَخْلُقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمْ الْخَالِقُونَ“ (کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟) معلوم ہوا کہ ہم نے خود اپنے آپ کو تو پیدا نہیں کیا، بلکہ ہم مخلوق ہیں۔ پس جو خالق ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ مخلوق پر اس کی مرضی چلے۔ یہی وہ بات ہے جو سورۃ الاعراف میں بایں الفاظ فرمائی گئی: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ (خبردار ہو جاؤ، وہی خالق ہے اور اسی کی حکومت و فرماں روائی ہے۔) ظاہر ہے کہ عقلِ سلیم اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی بات مانی جائے، اس کا حکم مانا جائے، اس کی اطاعت کی جائے اور اسی کی مرضی چلے۔ آدمی خود اپنا خالق نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے آباء و اجداد بھی اس کے خالق نہیں، وہ بھی مخلوق تھے۔ لہذا بجائے اس کے کہ بلا سوچے سمجھے آباء و اجداد کے طریقے کی پیروی کی جائے اور **وَجَعَلْنَا هَلَكَةً لِّهَؤُلَاءِ** (ہم نے اسی طریقہ پر اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے) کو دلیل بنا کر آباء پرستی شروع کر دی جائے، اس ہستی کی بندگی اور پرستش کرنی چاہئے جو خالق ہے۔ اس لئے آیت مبارکہ میں آگے اضافہ فرما دیا کہ: **وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** یعنی جو تم سے پہلے تھے ان سب کا خالق

بھی وہی اللہ ہے جو تمہارا خالق ہے۔ ان کے طور طریقے اگر خدا کے حکم کے مطابق ہوں تب تو ان کا اتباع کیا جائے گا، لیکن اگر ان کی روش اس کے برعکس ہو تو ان کو کوئی استناد حاصل نہیں۔ ان کا یہ حق ہرگز نہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے۔ اس لئے کہ خالق سب کا اللہ ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ صرف تمہارا خالق ہی نہیں، بلکہ وہ تمہارا ”رب“ بھی ہے۔ وہ تمہاری تمام ضروریات پوری کر رہا ہے۔ تمہیں درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے اور ہر درجہ کی تمام ضروریات کا اہتمام کرتے ہوئے تمہیں تمہارے مقام کمال کی طرف لے جا رہا ہے۔ ماں کے دل میں ماما، باپ کے دل میں شفقت اور عزیزوں کے دل میں محبت اسی کی پیدا کردہ ہے۔ موسموں کا تغیر و تبدل، بارش کا یہ نظام، زمین میں روئیدگی اور نشوونما کی قوت اور اس پر تمہارے لئے نفع رساں چوپایوں کا وجود، یہ نظام شمسی اور اس میں موجود جذبہ باہمی، غرضیکہ یہ پورا نظام اسی کی شانِ ربوبیت کا مظہر ہے۔ پس وہی تمہارا خالق ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔

حکمتِ قرآنی کا ایک رمز

یہاں ایک بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن مجید بالعموم ایسے مقامات پر ربوبیت کو خلق پر مقدم کرتا ہے، حالانکہ ترتیب کے اعتبار سے خلق ربوبیت پر مقدم ہے۔ پہلے پیدا کرنا اور وجود بخشنا ہے، پھر اس کی ربوبیت و تربیت ہے۔ یہ دور اور مرحلہ خلق کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کا عام اسلوب یہی ہے کہ وہ ربوبیت کو خلق پر مقدم کرتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں بھی ربوبیت کو تخلیق پر مقدم کرتے ہوئے فرمایا گیا: **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ** ○ ”(اے نبی!) پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔“ اسی طرح یہاں بھی رب کے تصور کو مقدم کیا گیا اور تخلیق کے تصور کو مؤخر کیا گیا اور فرمایا کہ: ”اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو پیدا کیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔“ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھیے کہ ربوبیت کو تخلیق پر کیوں مقدم کیا گیا۔ انسان کے ذہن کا بچپن سے جو ارتقاء ہوتا ہے اگر ہم اس

کا جائزہ لیں اور اس کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن سب سے پہلے جس چیز کا اثر قبول کرتا ہے اور اس میں جو شعور و احساس سب سے پہلے اجاگر ہوتا ہے وہ ربوبیت ہی کا اثر اور احساس ہے۔ ایک چھوٹے سے بچے کے ذہن کی کائنات بڑی ہی محدود ہوتی ہے، لیکن اپنے والدین کے بارے میں یہ تاثر (Impression) بہر حال اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے کہ میری ہر ضرورت یہی فراہم کرتے ہیں۔ مجھے بھوک لگتی ہے تو غذا اور خوراک کا اہتمام کرتے ہیں، مجھے اگر کہیں سے کوئی خطرہ اور خوف لاحق ہو جائے تو میں لپک کر ان کی گود میں پناہ لے لیتا ہوں، لہذا یہ میرے محافظ بھی ہیں۔ گویا کہ ربوبیت کے تصور کے ساتھ جتنی چیزیں بھی وابستہ ہیں، ان کا تاثر اس کے ذہن کی محدود کائنات میں موجود رہتا ہے اور والدین کے لئے ایک جذبہ تفکر اس کے دل میں ابھرتا رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے سورہ بنی اسرائیل میں والدین کے لئے یہی لفظ ربوبیت استعمال کیا ہے۔ آیت ۲۳ میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے ان کے لئے یہ دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے کہ: وَقَبِّ لَوْحَهُمَا كَمَا رَبَّخَنِىْ صَغِيرًا ”اے میرے پروردگار ان دونوں (والد اور والدہ) پر رحمت فرمائیے جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔“ یہ ربوبیت کا تصور ہے جو انسان کے ذہن میں سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔

آگے چل کر صرف یہ فرق واقع ہوتا ہے کہ جوں جوں اس کا افق ذہنی وسیع ہوتا ہے اور اس کی فکر کا دائرہ پھیلتا ہے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ والدین کے علاوہ مجھے اپنے بہن بھائیوں، اعزہ و اقرباء اور برادری کی حمایت اور تحفظ بھی حاصل ہے۔ جب وہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو اس میں یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ معاملہ صرف رشتہ داروں اور برادری تک محدود نہیں ہے بلکہ مجھے ایک پورے نظام کی پشت پناہی حاصل ہے، میری قوم اور میرا ملک میری پشت پر ہے۔ جب اس کا ذہن مزید ترقی کرتا ہے تو اس سے آگے جا کر انسان کے مادی علم کا نقطہ عروج یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ اس کی ربوبیت اور اس کی ضروریات کی فراہمی کا تو ایک بڑا ہی وسیع و عریض نظام ہے۔ اس میں سورج کا بھی دخل ہے، اور ہواؤں کے چلنے، بارش کے برسنے، اور موسموں کے تغیر و تبدل کو بھی ایک فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ کائنات کا یہ پورا

نظام اور اس کی ہر چیز اس کی ربوبیت اور اس کی ضروریات کی کفالت کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ گندم کا ایک دانہ جو زمین سے اُگتا ہے تو اس کو اگانے میں نہ معلوم قدرت کی کتنی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ یہ انسان کے مادی علم کا نقطہ عروج (Climax) ہے۔

اس کے بعد انسان اگر ایک چھلانگ اور لگے تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ اسباب ایک مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے، یہ سارا نظام جو نگاہوں کے سامنے ہے ایک ایسی ہستی کے دستِ قدرت میں ہے جو نظر نہیں آ رہی۔ وہ ہمارے حواس اور ہماری قوتِ واہمہ سے بھی ماوراء ہے۔ لیکن وہ ہستی موجود ہے جو اس کائنات کی خالق بھی ہے، موجد بھی ہے، مدبر بھی ہے اور رب بھی ہے۔ اس کائنات کا سارا نظام اسی کے قانون میں جکڑا ہوا ہے اور اسی کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے مطابق عالمِ امر میں بھی اسی کا قول کُن کارفرما ہے اور عالمِ خلق بھی اسی کی تدبیر کا مہیون منت ہے۔ جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو معلوم ہوا کہ اب انسان کو ربوبیت کی معرفت نامہ حاصل ہو گئی۔ اب اس نے جان لیا کہ میرا رب، میرا پالنے والا، میرا روزی رسا، میری ضروریات کا کفیل اللہ ہے جو میرا خالق بھی ہے۔ قرآن حکیم میں ربوبیت کو خلق پر مقدم کرنے میں یہی رمز پوشیدہ ہے کہ انسان کو ربوبیت کا تصور پہلے حاصل ہوتا ہے۔

ربوبیتِ خداوندی کے دو مظاہر

عام طور پر جب ہم رب کی شرح کرتے ہیں تو بس ربوبیتِ جسمانی پر اُکڑ ٹھہر جاتے ہیں، حالانکہ ربوبیت صرف جسم و جان کی ضروریات کی فراہمی تک محدود نہیں بلکہ ربوبیت یہ ہے کہ ہمارا رب جس طرح ہمارے جسم و جان کی ضروریات کی فراہمی کا اہتمام کر رہا ہے، اسی طرح وہ روح و عقل کی رہنمائی کا بھی بندوبست کر رہا ہے۔ جس طرح وہ ہمارے وجودِ خاکی کے داعیات اور تقاضوں کے لئے اسباب و سامان فراہم کرتا ہے اسی طرح وہ ہمارے ملکوتی وجود یعنی روح کی بالیدگی اور رہنمائی کے لئے بھی انتظام کرتا ہے۔ ”ذَیِّ سَمْعٰتٍ“ کے الفاظ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ میرا وہ

رب جس پر میری ربوبیت موقوف ہے وہی مجھے ہدایت دینے والا ہے، وہی راستہ دکھانے اور کھولنے والا ہے۔ تو انسان جب یہ معرفت حاصل کر لیتا ہے کہ جس کی بارگاہ سے میری تمام مادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں میری عقل کی رہنمائی کا اہتمام اور میری روح کی نفس کی سیرابی کا انتظام و التزام بھی اسی کی طرف سے ہوگا تو اسے قرآن مجید ”حکمت“ سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ لقمان میں فرمایا: وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اِذَا فُتِنَ لِلْبَيْتِ ”اور بے شک ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ شکر کر اللہ کا!“۔ یعنی انہیں دانائی، سمجھ، عقل کی پختگی اور شعور کی گہرائی عطا کی گئی تھی جس کا نتیجہ شکر الہی ہے۔ چنانچہ عقل کی معرفت حاصل ہوتے ہی سارا جذبہ شکر اللہ کی ذات کی طرف مرکوز ہو جائے گا۔ اسی حقیقت کا اظہار قرآن مجید کی پہلی آیت میں ہے کہ: ”لِلّٰهِ الْحَمْدُ“ ”ربِّ الْعَالَمِينَ“ کہ ساری تعریف، حمد و ثنا، اور شکر و سپاس کا سزاوار اور مستحق صرف وہ اللہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

ربوبیت و تخلیق کی معرفت کا لازمی تقاضا

پس ”لَا تُهْمَا لِنَفْسٍ اَعْبَدُوا رَبَّكُمْ اَلَمْ يَخْلُقْكُمْ“ کے الفاظ میں دعوتِ عبادتِ رب کے لئے یہ دلیل نہیں ہے کہ تمہارا رب جس نے تمہاری جسمانی ربوبیت کے لئے کائنات کا یہ نظام بنایا اور تمہاری روح اور عقل کی رہنمائی کے لئے ارسالِ وحی، بشارتِ انبیاء و رسل اور انزالِ کتب کا سلسلہ قائم کیا اور جو تمہارا خالق بھی ہے وہی تمہاری بندگی اور پرستش کے لائق ہے، وہی تمہاری اطاعت اور محبت کا حق دار ہے۔ جب تم نے اپنے رب کو جان لیا اور تمہیں یہ معرفت حاصل ہو گئی کہ جو تمہارا خالق ہے وہی تمہارا رب اور مالک بھی ہے اور تم پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ نظام کائنات از خود چند لگے بندھے قوانین کے تحت نہیں چل رہا، بلکہ اس میں ہر آن اور ہر لمحہ اس کا حکم اور اس کا امر جاری و ساری ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا چاہئے کہ تم خود کو اپنے رب کے سامنے بچھاؤ، اس کے آگے جھک جاؤ اور خود کو پست کر دو اس کے سامنے تذلل و خضوع اور عاجزی و انکساری اختیار کرو، کمالِ محبت، کمالِ شوق اور کمالِ رغبت کے ساتھ اس کے جملہ احکام کی اطاعت کرو، اس

کے تمام قوانین کی پابندی کرو اور اپنی زندگی پوری کی پوری اس کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال دو۔ یہ اس دعوت کا لازمی تقاضا ہے۔

”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ کی تشریح

آیت کا آخری کلمہ (لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ) عبادتِ رب کے انجام و مال اور اس کے ثمر و نتیجہ کو بیان کر رہا ہے کہ اے بنی نوع انسان! تمہیں عبادتِ رب کی دعوت اس لئے دی جا رہی ہے ”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ تاکہ تم بچ جاؤ، تاکہ تم تقویٰ کی روش پر گامزن ہو سکو! تقویٰ کا اصل مفہوم ہے ”بچ جانا“ یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا اور نتیجہ اس کی ناراضگی اور سزا سے بچ جانا۔ اسی مفہوم سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ کی اطاعت میں انسان خوب مبالغہ کرے، آگے بڑھے، تفصیل میں جا کر اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے، اللہ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو اور انہیں اپنا اوڑھنا بھوننا بنائے۔ یہ بھی تقویٰ ہے، لیکن تقویٰ کا اصل بنیادی مفہوم ”بچ جانا“ ہے۔ عربی لغت میں تقویٰ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کسی خاردار جنگل میں سے گزرتے ہوئے جس طرح جھاڑ جھکاڑ اور کانٹوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہے کہ مبادا کسی کانٹے میں نہ الجھ جائیں۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے انسان سے یہی طرز عمل مطلوب ہے۔ یہاں جو فرمایا گیا ”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ تو وہ اصل میں لغت کے اعتبار سے ہے ”تاکہ تم بچ جاؤ“ یعنی عبادتِ رب کی دعوت قبول کر کے ہلاکت و بربادی اور دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے بچو گے۔ اور اگر عبادتِ رب کو اپنی زندگی میں اختیار نہ کیا، اپنی عقل کے پیچھے لگ گئے، اپنے مذمومہ خیالات و نظریات کا ساتھ دیا، اپنی باگ ڈور اپنے نفس کے ہاتھ میں دے دی، یا نانہ کے چلن کے مطابق چلنا شروع کر دیا تو دھکے کھاؤ گے۔ کبھی ایک انتہا تک جاؤ گے اور پھر وہاں سے دھکا لگے گا تو دوسری انتہا تک جاؤ گے، اور اس طرح گیند کی طرح ادھر ادھر لڑھکتے رہو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ نوع انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ انسان دراصل افراط و تفریط کے مابین دھکے کھا رہا ہے۔ انسان نے جاگیرِ اولاد نظام سے بچ

نکلنے کی کوشش میں اپنے لئے جمہوریت کا نظام تجویز کیا، لیکن جمہوریت کا دور شروع ہوا تو اس میں وہ خباثتیں موجود تھیں جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی انتہائی کسمپوش صورت اختیار کر لی اور یہ نظام Capitalism کی انتہا کو پہنچا۔ اس انتہا تک پہنچ کر انسان نے سوچا کہ وہ ایک جاہلی اور ہلاکت سے دو چار ہو گیا ہے تو پھر واپس لوٹا، لیکن اس رجعت کے نتیجے میں دوسری انتہا تک جا پہنچا۔ اب اس نے اپنی عقل سے یہ نظام تجویز کیا کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے تمام ذرائع و وسائل کو بالکل ایک مرکزی نظام کے تحت لے آنا چاہئے۔ اس طرح انسان کی انفرادیت اور اس کی آزادی سلب ہو گئی اور انسانیت ختم ہو کر رہ گئی۔ اب سب کے سب انسان حیوانی سطح پر آ گئے اور پورا ملک ایک جیل خانہ بن گیا۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ درحقیقت انسان کا دھکے کھانا ہے۔ پس اگر انسان عبادتِ رب کی روش اختیار نہیں کرے گا اور خدا کی اطاعت اختیار کر کے اس کی مرضی کے مطابق نظام قائم نہیں کرے گا تو اسی طرح دھکے کھاتا رہے گا۔ ایک طرف جانے کے بعد پھر وہاں سے گھبرا کر واپس لوٹے گا لیکن پھر بھی اس کا قدم سواء السبیل پر نہیں نکلے گا اور وہ ایک دوسری انتہا تک جا پہنچے گا۔ وہاں پہنچ کر کوئی اور رستہ عمل پیدا ہوگا تو کہیں تیسری طرف جا لگے گا۔ افراط و تفریط کے ان دھکوں سے بچ نکلنے کی واحد صورت یہی ہے کہ عبادتِ رب کی اس دعوت پر لبیک کہا جائے اور اللہ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔ دنیا میں یہ وہ صراطِ مستقیم، سواء السبیل اور قصد السبیل ہے جسے درمیانی راستہ کہا گیا ہے۔ یہ متوسط شاہراہ ایک ایسا عادلانہ نظام رکھتی ہے جو ہر اعتبار سے متوازن ہے، جس میں زندگی کے تمام تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ سمودیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی بندگی کا راستہ ہے اور اس کی اطاعت کا نظام ہے۔ اسے اختیار کر کے نوعِ انسانی دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچ سکتی ہے۔ تو یہ ہے تقویٰ کا اصل مفہوم!

غور کا مقام

یہ بات سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن کی اصل دعوت عبادتِ رب ہے اور اس کی

مخاطب کوئی ایک قوم، کوئی ایک گروہ یا کوئی ایک طبقہ نہیں، بلکہ علی الاطلاق پوری نوع انسانی ہے، ہمارے لئے غور کا اصل مقام یہ ہے کہ اس وقت اس دعوت کی امین امت مسلمہ ہے، جو بد قسمتی سے آج خود اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ وہ خود اس بات کی محتاج ہے کہ اس تک یہ دعوت پہنچائی جائے۔ نوع انسانی تک قرآن کی یہ دعوت پہنچانا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے، لیکن بجائے اس کے کہ ہم اس دعوت کو لے کر اٹھتے اور اپنے قول و عمل سے اسے نوع انسانی کے سامنے پیش کرتے ہم پستی کی اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ سب سے پہلے ہم خود محتاج ہیں کہ ہم کو یہ دعوت پہنچائی جائے۔ چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے ہم خود اس دعوت پر لبیک کہیں، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو استوار کریں، اور پھر دنیا کے سامنے اس دعوت کے داعی بن کر کھڑے ہو جائیں۔

فرض عبادات کا بندگی رب سے تعلق

عبادت کے اس وسیع اور جامع مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب یہ جان لیجئے کہ فرض عبادات یعنی ارکان اسلام کا اس سے تعلق کیا ہے۔ میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں کہ یہ عبادات اس عظیم عبادت یعنی خدا کے سامنے بچھ جانے کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں عمدہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان عبادات کا دراصل بڑا ہی حکیمانہ نظام ہے۔ ان سے انسان میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ صلاحیت و اہلیت اجاگر ہوتی ہے جس سے وہ عبادت رب کی راہ میں پیش آنے والے موانع کو دور کر سکتا ہے۔

نماز کا اصل مقصد: عبادت رب اور اطاعت خالق میں سب سے بڑی رکاوٹ جو انسان کو درپیش ہوتی ہے وہ غفلت، لسیان اور بھول ہے۔ انسان کا اپنے معمولات میں حد درجہ الجھ جانا اور منہمک ہو جانا، اور ان میں کولہو کے تیل کی طرح مصروف رہنا دراصل ایک ایسا چکر ہے جو انسان کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے۔ اس لفظ ”گم“ سے میرا ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوا ہے کہ ۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

تو انسان کی کیفیت عام طور پر یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اپنی ضروریات کی فراہمی میں، اور اپنی پریشانیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کاروبار کی فکر، ملازمت کی فکر، کام کی فکر، اہل و عیال کی فکر، بچوں کے دکھ اور بیماری کی فکر، بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شادی بیاہ کی فکر اور نہ جانے کتنے تفکرات کے روگ ہیں جو انسان کو لاحق رہتے ہیں اور جن میں وہ گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس گمشدگی کی حالت سے انسان کو نکلنے کے لئے نماز، ہنگامہ کا نظام ہے۔ نماز انسان کو دن میں پانچ مرتبہ ان تمام مصروفیات سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَلَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَلَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

”نماز کو قائم کرو میری یاد کے لئے۔“ دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور کھڑے ہو اور ہر رکعت میں اپنے اس عہد و میثاق کو تازہ کرو کہ: **هَآكِنَا نَعْبُدُكَ وَهَآكِنَا نَسْتَعِينُ** ”پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے، اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔“ ہر رکعت میں اپنے اس قول و قرار کی از سر نو تجدید کر کے اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کر لو، اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو اپنے شعور میں اجاگر کر لو اور اس ہستی کو یاد رکھو جس سے تم نے یہ عہد و وفاداری استوار کیا ہے۔ نماز کا اصل مقصد ہی یاد الہی ہے اور اسی یاد الہی سے ان حقائق کی تذکیر ہوتی ہے جن کا نام ایمان ہے۔ پس نماز وہ فریضہ ہے جو انسان کو اس گمشدگی کی حالت سے دن میں پانچ بار نکالتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ کسی کا غلام و بندہ ہے، کسی سے اس نے عہد اطاعت اور عہد وفا استوار کر رکھا ہے اور اسے اپنے تمام معمولات میں اس عہد و میثاق اور قول و قرار کی پابندی کرنی ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت: عبادتِ رب کے راستے کی دوسری سب سے بڑی رکاوٹ محبتِ مال ہے۔ یہ مال کی محبت ہی ہے جو انسان کے چہر کی بیڑی بن جاتی ہے۔ انسان کی نگاہوں پر جو سب سے بڑا پردہ پڑ جاتا ہے وہ دنیا کی محبت کا ہے، جس کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے بڑی علامت (Symbol) محبتِ مال ہے۔ آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ محبتِ دنیا ”محبتِ مال ہی کا منطقی نتیجہ ہے“ اس لئے کہ مال ہی وہ ذریعہ ہے جس سے آپ دنیا کی ہر چیز حاصل کر سکتے ہیں۔ شہرت، شہمت، وجاہت، عزت، منصب، اقتدار، غرضیکہ نفس کی ہر مطلوب شے مال کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ شوکت و

سلطوت اسی کی لوٹیاں ہیں اور قیث و راحت اسی کے غلام ہیں۔ گویا کہ دنیا اور مال لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ مال کی محبت کو کم کرنے اور اس کو دل سے کھرچنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام تجویز کیا گیا کہ اپنے مالوں میں سے زکوٰۃ صدقات اور خیرات نکالو اور انہیں اللہ کی خوشنودی کے لئے صرف کرو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: **خُذْ مِنْ مَّا لَكُمْ صَلَاقًا تُطْعَمُ بِهِمْ وَ تُزَكَّوْهُمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳)** یعنی ان کے اموال میں سے صدقات (واجبہ و ناقلہ) وصول کیجئے کہ آپ اس کے ذریعے سے انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔ مال کی محبت کو دل سے نکالنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ یہ مال ہی وہ چیز ہے جس کے لئے انسان حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتا ہے اور خدا کے احکام سے رُود گردانی کرتا ہے۔ چنانچہ حُب مال کے ازالے کے لئے علاج بالمثل تجویز کیا گیا کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں! اس طرح حُب مال کی یہ نجاست دل سے دھلے گی اور تمہارا تزکیہ ہو گا۔

روزہ کی حکمت: عبادت رب کی تیسری بڑی رکاوٹ ہمارے نفس کی خواہشات اور اس کے کچھ داعیات ہیں جو فی الاصل جائز خواہشات و داعیات ہیں اور ان میں سے کوئی بھی بجائے خود گناہ نہیں۔ ہمیں زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کھانے کی ضرورت ہے، ہم پانی کے محتاج ہیں، اسی طرح ہوا و نسل کے لئے انسان کے اندر جنسی جذبہ رکھا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی جگہ پر نہ صرف درست بلکہ ضروری ہیں۔ لیکن ان خواہشات و داعیات میں حد اعتدال سے تجاوز کا ایک مادہ موجود ہے اور جب یہ حد اعتدال سے تجاوز کرتی ہیں تو قحطا کرتی ہیں کہ اصل حکم ہمارا چلے گا، تمہارا یا تمہارے خدا کا نہیں۔ نفس کے اندر جب ہیجان پیدا ہوتا ہے اور جنسی جذبہ اشتعال میں آتا ہے تو نفس گویا یہ مطالبہ کرتا ہے کہ میرا یہ قحطا لازماً پورا ہونا چاہئے، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ خدا کیا کہتا ہے، رسول کا کیا حکم ہے، حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے! نفس کے اس منہ زور گھوڑے کو قابو میں کرنے کے لئے اور اس کے قحضوں اور داعیوں کو ایک فطری حد تک محدود رکھنے کے لئے روزہ فرض کیا گیا۔ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** ○ اے وہ لوگو جو ایمان

حج کی جامعیت: اب رہا حج تو اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ تمام چیزیں جمع ہوگئی ہیں جو ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں یاد الہی بھی ہے، وقتی طور پر علاقئ دنیوی سے کٹ جانا بھی ہے، انفاق مال بھی ہے، جسمانی مشقت بھی ہے اور نفس کے تقاضوں کو ضبط میں رکھنے کی مشق بھی ہے۔ چنانچہ حج ایک انتہائی جامع عبادت ہے۔

تو یہ چاروں عبادات انسان کو اس طرح تیار کرتی ہیں کہ وہ عبادتِ رب کے راستے پر گامزن ہو سکے جو اس کی غرض تحقیق ہے اور وہ اپنے اس عہد پر قائم رہ سکے جو اس نے دنیا میں آنے سے قبل عالم ارواح میں کیا تھا، جو سورۃ الاعراف میں بایں الفاظ مذکور ہے: "اَلَا لَسْتُ بِرَبِّكُمْ" قَالُوا اٰهٰیؕ یعنی جب رب تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب پکار اٹھے کہ کیوں نہیں، ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے! اور جس عہد کی تجدید ہم پانچوں نمازوں کی ہر ہر رکعت میں کرتے ہیں۔ اسی رب کی غلامی اور بندگی کی دعوت آیت زیر مطالعہ میں دی جا رہی ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَاَلَيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ زندگی گزارنے کے اس طریقہ پر اپنے آپ کو پوری طرح قائم رکھنے کے لئے ہمیں جن قوتوں کی ضرورت ہے اور اس کے موانع اور رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمیں جو طاقت درکار ہے وہ ان عبادات کے نظام کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔

”اے لوگو! بدی کی کو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، تاکہ تم (دنیا میں افراط و تفریط کے دھکے کھانے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے دو چار ہونے سے) بچ جاؤ!!

مطالباتِ دین

شہادت علی الناس

سورۃ البقرہ کی آیت ۴۳ کی روشنی میں

دین کا دوسرا اہم تقاضا



نَعْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

مطالباتِ دین کے ضمن میں ”فریضہ بزرگی رب“ کے بعد دین کا دوسرا عظیم مطالبہ اور تقاضا ”شہادت علی الناس“ کے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ یہ مطالبہ سورۃ البقرہ کے ۷۱ویں کوع کی تیسری آیت میں ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے :

وَكُلِّبَكَ جَعَلْنٰكَ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُوْنُوا شٰهَدَةً عَلٰی النَّاسِ وَتَكُوْنُ الْمَرْسُوْلُ
عَلَيْكُمْ شٰهِدًا (البقرہ: ۱۴۳)

”اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔“

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس آیتِ کریمہ کے بھی ایک ایک لفظ کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کے ہر ہر لفظ کے حوالے سے وہ سبق، وہ ہدایت، اور وہ رہنمائی ذہن نشین کر لیں جو اس آیت کے ذریعہ ہر مسلمان کو انفرادی طور پر اور امت مسلمہ کو اجتماعی طور پر دی جا رہی ہے۔

آیتِ مبارکہ کا محل و مقام

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کے مقام اور محل کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اور اس سلسلہ کلام سے بھی واقفیت حاصل کر لی جائے جس کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔ قرآن حکیم ایک مربوط کلام ہے اور اس کی ہر آیت سلسلہ کلام سے مربوط و تعلق رکھتی ہے۔ ہم قرآن کے لئے نظم آیات اور سیاق و سباق کا علم انتہائی ضروری ہے۔ لہذا اولاً ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا بحث اور گفتگو چل رہی ہے جس کے ضمن میں یہ آیت مبارکہ ایک اہم کڑی کی حیثیت سے وارد ہوئی ہے۔

”دعوتِ بزرگی رب“ کے ذیل میں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ البقرہ کے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانی کرداروں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے نازل کردہ اس کتاب ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر و ضلالت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ان پر تعصب اور غمخ کا اتنا شدید غلبہ ہو گیا ہے کہ اب انہیں کوئی دعوتِ تبشیر و اندازِ نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اور تیسرے وہ کہ جو بین بین ہیں، جو اگرچہ اپنے آپ کو اہل ایمان ہی میں شمار کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کو نفاق کا مرض لاحق ہے اور وہ اہل ایمان نہیں ہیں۔ تیسرے رکوع میں قرآن حکیم کی مرکزی اور آفاقی دعوت ”دعوتِ بندگیِ رب“ بیان کی گئی ہے، جس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ چوتھے رکوع میں حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان کو خلافتِ ارضی عطا کئے جانے کا ذکر ہے، پھر حضرت آدمؑ کے سامنے سر بہود ہونے سے انکار پر ابلیس کے ساتھ پیش آنے والے معاملے اور حضرت آدمؑ و حوا اور ابلیس لعین کے ہبوطِ ارضی کا ذکر ہے۔ بعد ازاں پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل کی حیثیت درحقیقت سابقہ امتِ مسلمہ کی ہے۔ شریعتِ محمدیؐ سے قبل کی شریعتِ موسویؑ ہے اور بنی اسرائیل حاطینِ کتاب و شریعت تھے۔ اس مفصل خطاب میں اس امت (بنی اسرائیل) کے جو جرائم تھے، ان کی جو غلطیاں تھیں، انہوں نے جس جس طریقہ سے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور جس طرح اپنے فرائض سے کوتاہی کا ثبوت دیا تھا انہیں اس کی ایک مسلسل فرد قرار دادِ جرم سنائی گئی ہے۔ گویا بنی اسرائیل کے تمام جرائم کا ایک خلاصہ نکال کر ان دس رکوعوں میں رکھ دیا گیا اور پھر اعلان کیا گیا کہ اے بنی اسرائیل! ان جرائم کی پاداش میں تم ”امتِ مسلمہ“ کے مقام و مرتبہ سے معزول کئے جا رہے ہو اور اب اس مقام پر تمہاری جگہ ایک نئی امت کو فائز کیا جا رہا ہے اور وہ ہے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس نئی امت کے لئے بیت اللہ الحرام ہی کو قبلہ مقرر کیا جا رہا ہے جو ہمیشہ سے تھا، اور وہ قبلہ جو بنی اسرائیل کی امت کے لئے مقرر کیا گیا تھا یعنی بیت المقدس اس کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ چودھویں رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب کے خاتمہ کے بعد پہلے بیت اللہ کی تاریخ بیان کی گئی اور اس کے معمارِ اول جناب حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہؑ اور جناب حضرت اسحاقؑ و یسحاقؑ نے خدا کے اس گھر کی تعمیر کے وقت اس کے حضور جو دعائیں کی تھیں ان کا ذکر آیا۔ پھر سترہویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور اس کے ساتھ ہی

آیت زیر درس میں 'امت محمد' کا امت وسط (بہترین امت) کے مقام پر فائز کئے جانے کا اعلان ہوا۔ تحویل قبلہ گویا اس امر کا اعلان (Declaration) ہے کہ بنی اسرائیل، جن کا قبلہ بیت المقدس تھا، آج اس مقام سے معزول کئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ منصب عطا کیا جا رہا ہے۔ یہ ہے وہ سلسلہ کلام جس کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے۔

امت مسلمہ کی غرض تائیس

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں درحقیقت اس امت کی غرض تائیس بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ امت کیوں بپا کی جا رہی ہے، اس کا قیام کس لئے عمل میں لایا جا رہا ہے؟ چنانچہ فرمایا گیا:

وَكُنْزِكَ جَعَلْنٰكُمْ لِنَا وَسَطًا لِّتَكُونُوا قَهْلَةً عَلَى النَّاسِ وَتَكُونَ لِّلرَّسُولِ
عَلَيْكُمْ قَهْلًا

”اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو امت وسط (بہترین امت) تاکہ ہو جاؤ تم گواہ پوری نوع انسانی پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر“

اس آیت مبارکہ میں سب سے پہلا لفظ ”كُنْزِكَ“ ہے جس کا ترجمہ ہوگا: ”ایسے ہی“ یا ”اسی طرح“۔ گویا کہ اس کلمہ ”كُنْزِكَ“ نے اس اعلان کو تحویل قبلہ کی بحث کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ یعنی جو تحویل قبلہ کا حکم دیا جا رہا ہے اسے کوئی معمولی سا واقعہ نہ سمجھو۔ یہ تو درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب امت بنی اسرائیل کا وقت ختم ہوا، وہ معزول کر دیئے گئے، ان کا قبلہ منسوخ کر دیا گیا اور اب اس قبلہ ابراہیمی کے گرد ایک نئی امت امت محمد (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تائیس و تشکیل ہو رہی ہے جسے ”قہلات علی الناس“ کی ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے جو ذمہ داریاں بنی اسرائیل کے سپرد کی گئی تھیں وہ اب اس نئی امت کے سپرد کی جا رہی ہیں۔ ”كُنْزِكَ“ کا مفہوم دراصل یہ ہے۔

لفظ ”امت“ کیوں استعمال ہوا؟

”کَذٰلِكَ“ کے بعد الفاظ ہیں: ”جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَ سَطًا“ (ہم نے تم کو بنایا درمیانی امت یا بہترین امت!) اس کلمے میں سب سے پہلے لفظ ”امت“ پر غور کیجئے۔ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ”امت“ ہے۔ پورے قرآن مجید میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ظاہر کرنے کے لئے کہیں بھی لفظ ”قوم“ استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح حدیث نبویؐ میں بھی مسلمان امت کے لئے ”قوم“ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ قومیت کا جو تصور ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ قومیں یا تو نسل کی بنیاد پر بنتی ہیں یا علاقہ، ملک، وطن اور زبان کی بنیاد پر۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کو ایک قوم کے تشخص میں اساسی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی خاص ملک کی حدود میں رہنے والے ایک علیحدہ قوم کہلاتے ہیں، کوئی ایک زبان بولنے والے ایک الگ قوم تصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن قومیت کا یہ تصور ہمارے دین، ہماری تہذیب، ہمارے تمدن، اور ہماری روایات سے بالکل متناقض ہے۔ قرآن و حدیث کی روش سے اس کا ہماری ہیئتِ اجتماعیہ سے قطعاً کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے اس لفظ ”قوم“ کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا۔

”دعوتِ بندگی رب“ کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ تمام سابق انبیاء علیہم السلام کی دعوت اپنی اپنی قوم کے لئے تھی اور ان کا کلمہ خطاب ”یا قوم“ (اے میری قوم کے لوگو!) ہوتا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے حاملین کے لئے قرآن حکیم میں ”یا قوم“ کی بجائے ”یا اَیُّهَا النَّاسُ“ (اے بنی نوع انسان!) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گویا یہ قومیت سے ایک بلند تر منزل اور اس سے اعلیٰ و ارفع ایک مقام ہے کہ جہاں سے اب بات شروع کی جا رہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے، جنہوں نے عبادتِ رب کے نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے، جو خدا کے ساتھ اطاعت و فرمانبرداری کا عہد استوار کر رہے ہیں وہ اب مل جل کر ایک جمعیت بنیں گے تو ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ”قوم“ سے تعبیر نہیں کیا جائیگا، بلکہ اس کے لئے قرآن مجید کی اصل

اصطلاح ”امت“ ہے۔ ماہرین لغت نے امت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ایسے افراد پر مشتمل ایک ہیئت اجتماعیہ جن کے مابین کوئی قدر مشترک، کوئی امر جامع یا چند ایسے مسئلہ اصول ہوں جو انہیں جوڑے رکھیں۔ چنانچہ ہماری جمعیت کے لئے اصل لفظ ”امت“ کا ہے۔ دوسرا لفظ جو مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے لئے بولا جاتا ہے اور خصوصاً ہماری شاعری میں بہت زیادہ مستعمل ہو گیا ہے وہ لفظ ”ملت“ ہے۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید میں لفظ ملت نہ تو قوم کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ ہی امت کے۔ بلکہ ملت کا اصل ترجمہ ہے ”طریقہ، کیش“۔ ملت ابراہیم کا مفہوم ہوگا ”ابراہیم کا طریقہ“ چنانچہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے لئے لفظ ملت کا استعمال بھی درست نہیں، بلکہ لفظ امت ہی اس مفہوم کی ادائیگی کرتا ہے۔ اس مفہوم کے لئے قرآن مجید کا دوسرا لفظ ”حزب“ ہے جس کا صحیح ترجمہ ”پارٹی“ ہوگا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ”لَوْ لَيْتَكَ حِزْبُ اللَّهِ“ کہ یہ اللہ کی پارٹی ہے، اللہ کی جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہد وفاداری استوار کیا ہے اور اس کی اطاعت کا قلابہ اپنے گلے میں پہن لیا ہے۔ رہا باقی لوگوں کا معاملہ تو جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ عہد اطاعت استوار کیا ہے تو وہ سب کے سب ”حزب الشیطان“ ہیں۔ اس طرح قرآن مجید پوری نوع انسانی کو دو جماعتوں یا دو پارٹیوں میں تقسیم کرتا ہے — ایک حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی اور دوسری حزب الشیطان یعنی شیطان کی پارٹی۔ مقدم الذکر کے بارے میں فرمایا گیا: ”لَوْ لَيْتَكَ حِزْبُ اللَّهِ لَا يَنْ حِزْبُ اللَّهِ هُمْ الْمُفْلِحُونَ“ یہ ہیں وہ لوگ جو اللہ کی جماعت ہیں اور اچھی طرح سمجھ لو کہ (انجام کار کے طور پر) اللہ کی جماعت کے لوگ ہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ سورہ آل عمران میں بھی ہماری ہیئت اجتماعیہ کے لئے یہی لفظ ”امت“ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ”كُنْتُمْ خَمَّةً فَتَيَّةً“ تم بہترین امت ہو۔ اس ساری گفتگو کے نتیجہ میں لفظ امت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے — جو لوگ دعوتِ عبادتِ رب کو قبول کریں گے چاہے وہ کوئی ہوں، مغرب سے ہوں یا مشرق سے، شمال کے ہوں یا جنوب کے، کوئی زبان بولتے ہوں، کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، کسی شکل و صورت اور رنگ کے حامل ہوں، وہ سب بلا امتیاز ایک مجموعہ افراد بن گئے اور وہ از روئے قرآن ”امتِ مسلمہ“ کے رکن قرار پائیں گے۔

”امتِ وسط“ کا مفہوم

اس آیتِ مبارکہ میں ”امت“ کی صفت کے طور لفظ ”وسط“ استعمال ہوا ہے جس کا لغوی مفہوم ”درمیانی“ ہے۔ چنانچہ ”امتِ وسطا“ کا لفظی ترجمہ ہوگا ”ایک درمیانی امت“۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ ”بہترین امت“ کیا ہے جسے ترجمہ کی بجائے ترجمانی کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ جو چیز درمیانی ہو، وہی بہترین ہوتی ہے۔ جو چیز دو انتہاؤں (Extremes) کے درمیان ہو، معتدل ہو جس کے اندر ہر اعتبار سے توازن پایا جاتا ہو، وہی شے بہترین گردانی جائے گی۔ لہذا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس آیتِ مبارکہ کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے کہ ”اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بتایا۔“ اس مفہوم کی تائید سورہ آل عمران کی اس آیتِ مبارکہ سے ہوتی ہے کہ ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلْعَالَمِينَ“ یعنی تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لئے برپا کیا گیا ہے، تم بہترین مجموعہ افراد ہو، تم پوری نوعِ انسانی کا ”مکھن“ ہو، تم بنی نوعِ انسانی کے لئے بمنزلہ نمک ہو، تم سے ممکنہ حاصل کی جائے گی۔ اللہ کی ہدایت کی امانت تمہارے پاس ہوگی اور نوعِ انسانی اس ہدایت سے استفادہ کرے گی۔ پس یہ مفہوم ہوا ”امتِ وسط“ کا جس کی تائید ہمیں سورہ آل عمران کی ”خیر امت“ والی آیت سے مل گئی۔

”امتِ وسط“ کا ایک دوسرا مفہوم بھی لیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ لفظِ وسط ”واسطہ“ کا مفہوم رکھتا ہے اس اعتبار سے ”امتِ وسط“ کا مفہوم خدا اور انسانوں کے مابین واسطوں میں سے ایک واسطہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے مابین وسائط کا ایک سلسلہ ہے جس کی پہلی کڑی حضرت جبریل علیہ السلام ہیں کہ جن کے واسطہ سے ہدایتِ خداوندی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ دوسرا واسطہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے کہ پوری نوعِ انسانی ہدایت کے لئے آنحضورؐ کی محتاج ہے۔ نوعِ انسانی اگر ہدایتِ ربانی حاصل کرنا چاہتی ہے، وہ خدا سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں، حق کیا ہے، باطل کیا ہے، صبح کیا اور غلط کیا ہے تو اس کے لئے وہ مجبور ہے کہ یہ ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس سلسلہ وسائط کی تیسری کڑی ہے امتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

اس لئے کہ نبی اکرمؐ کی طرف سے ہدایت کی امانت امت کو منتقل ہو گئی۔ حضورؐ نے سرزمین عرب کی حد تک اپنے فرمانے تبلیغ و رسالت کی بغیر نفیس تکمیل فرما کر یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرمادی۔ قرآن حکیم میں وحی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بایں الفاظ بیان کی گئی ہے: **وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأَشَدَّ كُمْ بِهِ وَمِنْ بَلَاغِ** (۱۹:۶) ”اور میری طرف سے یہ قرآن وحی کیا گیا تاکہ اس کے ذریعے تم کو اور جس جس کو یہ (قرآن) پہنچے ان سب کو خبردار کروں۔“ جس کو یہ قرآن پہنچ جائے اس پر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت ہو جائے گا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کی روشنی کو عام کرنا اور دنیا بھر کے انسانوں تک پہنچانا امت کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ بنی نوع انسان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا جو سلسلہ قائم ہوا ہے اس میں پہلا واسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا، دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا اور تیسرا واسطہ امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ اور یہ کتنا غلط نہیں ہے کہ یہ امت اسی لئے ”امت وسط“ کہلاتی ہے کہ یہ اس سلسلہ ہدایت کی ایک کڑی اور ایک واسطہ ہے۔

اس بات کی تائید اسی آیت مبارکہ کے اگلے کلمے سے ہو رہی ہے، جہاں فرمایا گیا: **لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَلَتَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا**۔ ”تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔“ تو گویا یہاں وساطت کا وہ سلسلہ واضح کیا جا رہا ہے کہ اے امت محمد! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تم تک ہماری کتاب ہدایت اور دین حق کی تبلیغ، تعلیم اور تمہیں کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ اپنے قول اور اپنے عمل سے حق کی شہادت دے چکے اور اللہ ہی اطاعت پر بنی نظام زندگی بالفعل قائم کر کے دکھا چکے۔ یہ گویا رسولؐ کی گواہی ہو گئی تم پر۔ اور اب یہی گواہی بنی نوع انسان پر قائم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یعنی اب تمہیں اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہدایت اور دین حق کو عملاً نافذ کر کے دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے۔

امت مسلمہ کا اجتماعی نصب العین

آیت کے اس کلمے پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ ”لَتَكُونُوا“ کے آغاز میں جو

حرف ”لام“ آیا ہے یہ ”لام غایت“ بھی ہے جو ایک مقصد کو معین کر رہا ہے ”تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ!“۔۔۔ یعنی تمہاری جمعیت جسے ”امت وسط“ کا نام دیا گیا ہے ایک بے مقصد جمعیت نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک معین مقصد اور ایک مقرر نصب العین ہے۔ تمہاری ہیئت اجتماعیہ دنیا کی تمام ہیئت اجتماعیہ سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ تمام اقوام عالم اپنے لئے جیتی ہیں، لیکن تمہیں نوع انسانی کے لئے زندہ رہنا ہے۔ ان کے پیش نظر اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ اپنی عزت، اپنے وقار، اپنے مسائل، اپنے مفادات اور اپنی آزادی کے تحفظ کی فکر کریں اور اپنی روایات اور اپنی مصلحتوں کا لحاظ رکھیں۔ لیکن تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس ضمن میں سورہ آل عمران میں فرمایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ لُغَةٍ لَّعَرِجْتُمْ لِلنَّبِيِّ فَاُْمُرُونَ بِالْمَعْرُوبِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

”تم وہ بہترین امت ہو، جسے نبی نوع انسان (کی فلاح و بہبود) کے لئے بپا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر (بختہ) ایمان رکھتے ہو۔“

یعنی لوگوں کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اس ”خیر امت“ کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد خود اپنے ذاتی مفادات کا حصول اور اپنے مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ ہماری ہیئت اجتماعیہ کی اصل غرض تائیس نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں ”لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ“ کے الفاظ امت کے اسی آفاقی اور اجتماعی نصب العین کو بیان کر رہے ہیں۔

قوموں کے لئے اجتماعی نصب العین کی اہمیت

کسی بھی مجموعہ افراد اور ہیئت اجتماعیہ کے لئے ایک اجتماعی نصب العین ناگزیر ہوتا ہے، جس کے بغیر اس ہیئت اجتماعیہ کی حیثیت بے لنگر کے اس جہاز کی سی ہوتی ہے جس کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی اور وہ لہروں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو قیام پاکستان سے لے کر اب تک حالات دن بدن باہر ہوتے چلے گئے ہیں تو

اس کا اصل سبب میرے نزدیک یہی ہے کہ ہمارا کوئی آفاقی اور اجتماعی نصب العین ہے ہی نہیں۔ ہم ایک ایسی قوم اور ایک ایسا مجموعہ افراد بن کر رہ گئے ہیں کہ جن کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ذاتی معاملات و مسائل میں غلطاں و پیچاں، اپنے ذاتی مفادات و اغراض کے حصول میں کوشاں اور اپنے معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کے سامنے اس کی مساعی، اس کی جدوجہد اور اس کی کوشش و محنت کا کوئی دوسرا ہدف اور اس کی صلاحیتوں اور اوقات کا کوئی دوسرا مصرف سرے سے موجود ہی نہیں۔ لہذا اس کی ساری تک و دو اور دوڑ دھوپ کا مرکز و محور یہی بن کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنا گھر سجائے، اپنی بلڈنگیں اونچی کرے، اپنے کاروبار کو مزید ترقی دے، اپنے آرام و آسائش کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرے، اپنی کاروں کے ماڈل ہر سال بدلتا چلا جائے اور زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے تفریح کی نت نئی راہیں تلاش کرے۔ اجتماعی نصب العین کے فقدان کے سبب سے ہماری قومی زندگی ایک بہت بڑے خلا کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، جس کے ہولناک نتائج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی کے اندر قربانی اور ایثار کا کوئی جذبہ نہیں، اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی کا کوئی مادہ نہیں۔ جہاں تک دنیا کی دوسری اقوام کا تعلق ہے تو ان کی قومیت کی تائیس چاہے غلط بنیادوں پر ہوئی ہو لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ چاہے نسل کی بنیاد پر قوم بنے ہوں، چاہے وطن اور علاقہ کی بنیاد پر، لیکن ان میں جب ایک ”قوم“ ہونے کا شعور پختہ ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک اپنے ذاتی مقاصد اور مفادات ثانوی درجہ کے حامل ہو جاتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں اصل اہمیت ایک قومی نصب العین کو حاصل ہو جاتی ہے۔ ان میں یہ احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ ان کو اپنی قومی عظمت کے لئے کام کرنا ہے، اپنی قوم کے مفاد کے لئے کوشش کرنا ہے، اپنے وطن کی عظمت اور اس کا نام اونچا کرنے کے لئے کام کرنا ہے۔ لیکن ہم وہ بد نصیب قوم ہیں کہ جو اپنے نصب العین ہی کو بھلا بیٹھی ہے۔ یاد رہے کہ قومیت کا نعرہ ہم کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تصور ہماری روایات اور تعلیمات سے بالکل متصادم ہے۔ زبان و نسل، رنگ و خون اور علاقہ و وطن کی بنیاد پر ہم کبھی بھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ہم خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور کیسی ہی پستی میں گر جائیں، لیکن

یہ چیزیں ہمیں کبھی بھی اپیل نہیں کر سکیں گی، اس لئے کہ آخر ہماری ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ ہے، ہماری تابندہ روایات ہیں، اور ماؤں کے دودھ کے ساتھ جو تعلیم ہمارے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اس میں یہ بات بھی بہر حال موجود ہے کہ یہ چیزیں ہمیں کبھی بھی اجتماعی حیثیت سے متاثر نہیں کر سکیں گی۔ ایک طرف یہ خوبی ہے، لیکن دوسری طرف ہماری یہ بد قسمتی ہے کہ ہمارا اصل نصب العین ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اس کا ہمیں شعور حاصل نہیں رہا۔ لہذا اب ہم اس خلا کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں اور بے لنگر جہاز کی طرح موجوں کے رحم و کرم پر ہچکولے لے رہے ہیں۔

اس مسئلہ پر میں ایک بات مزید عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی قوم کے سامنے اجتماعی نصب العین کے ہونے یا نہ ہونے سے کتنا عظیم الشان فرق واقع ہوتا ہے۔ آج دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ اور اکثر یورپی ممالک کی نوجوان نسل اس خلا سے دوچار ہے کہ اب ان کے سامنے کوئی اعلیٰ و ارفع نصب العین اور مقصد نہیں ہے، اس لئے کہ بحیثیت قوم ان کے سامنے جو سب سے اونچا نصب العین ان کے بزرگوں اور مفکروں نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ ایک فلاحی ریاست (Welfare State) قائم ہونی چاہیے اور تمام لوگوں کا معیار زندگی بلند ہونا چاہیے۔ اب کم از کم امریکہ کے اندر تو وہ معیار زندگی اس مقام کو پہنچ چکا کہ اس سے زائد کی توقع عبث ہے۔ وہاں حالت یہ ہے کہ اگر ایک گھر میں افراد چھ ہیں تو کاریں سات ہیں۔ ان حالات میں نئی نسل کے ایک امریکی نوجوان کے سامنے اب کیا مقصد اور کون سا نصب العین رہا؟ اب وہ کس کام کے لئے محنت کرے اور کس آئیڈیل کو اپنی مساعی کا ہدف بنائے؟ لہذا وہاں خلا کا ایک احساس ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج ہمیں سڑکوں پر جو بھی (Hippy) گھومتے نظر آ رہے ہیں اور مغرب میں جو سماج دشمن رجحانات (Anti Social Trend) بڑھتے جا رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوجوان نسل اُس دور کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے جس میں انسان تہذیب و تمدن سے بالکل غاری تھا اور وہ پہاڑوں کی غاروں کے اندر رہا کرتا تھا۔ یہ وحشیوں کے طریقے پر بڑھے ہوئے بال اور ناخن، یہ میلا اور گندا رہنے کا مذموم جذبہ، یہ دراصل ردِ عمل ہے ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے فقدان کا۔ یہ نہ سمجھیے کہ چند سر پھرے نوجوانوں نے ہی ازم کو اختیار کر لیا ہے اور وہ جہاں گردی کے لئے نکل کھڑے

ہوئے ہیں، بلکہ جن لوگوں کو امریکہ اور یورپ کی سیاحت کا اتفاق ہوا ہو وہ جانتے ہیں کہ چند بڑے بڑے افسروں (Executives) صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو چھوڑ کر وہاں کے بازاروں میں نوجوانوں کے غول کے غول اسی ہی فیشن میں نظر آتے ہیں اور یہی نقشہ ان کی یو نیورسٹیوں اور کالجوں میں نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس چین کے نوجوانوں میں یہ نقشہ بالکل نظر نہیں آئے گا۔ وہاں پر یہ مسئلہ اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ ان کے سامنے بہر حال ایک اجتماعی نصب العین موجود ہے۔ ان کے ذہنوں میں ایک بات رچائی اور بسائی گئی ہے اور کم از کم ہر چینی نوجوان اس جذبے سے سرشار ہے کہ اسے اپنے گرد و پیش اشتراکی انقلاب (Communist Revolution) برپا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایثار، قربانی، جدوجہد، محنت و کوشش اور مقصد کی لگن ان کے ہاں قومی سطح پر موجود ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی قوم کے پیش نظر ایک اجتماعی نصب العین ہونے یا نہ ہونے سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔

یہ بات تحریک پاکستان کے حوالے سے اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک کو تقویت اسی وقت حاصل ہوئی جب اس نے پاکستان کے مطالبہ کو ایک ”نصب العین“ کی حیثیت سے اختیار کیا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد چونکہ قوم کو کوئی واضح نصب العین نہیں دیا گیا لہذا یہاں قومی سطح پر نصب العین کا ایک خلا واقع ہو گیا۔ چنانچہ یہاں ہر فرد کی مساعی کا ہدف، اس کی جدوجہد و کوشش کی غرض و غایت، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز و محور اور اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ آسائش و آرام اور حصولِ معاش کے ذرائع تلاش کرے، زیادہ سے زیادہ الاٹمنٹ کرائے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے میں لگ جائے۔ لہذا یہی چیزیں ہر فرد کا ذاتی نصب العین بن کر رہ گئیں اور اجتماعی نصب العین اس نفسا نفسی میں گم ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے کوئی آفاقی اور اجتماعی نصب العین ہو۔ یہ ضرورت صرف مذہبی اور دینی لحاظ سے اور صرف آخرت کی جواب دہی کے اعتبار سے ہی نہیں ہے، بلکہ قومی زندگی کے اعتبار سے، ہمارے ملی تشخص کے اعتبار سے، اور نوجوان نسل کے سامنے زندگی کا ایک ارفع و اعلیٰ نصب العین لانے کے اعتبار سے۔

سے ہمارے لئے لازم اور ناگزیر ہے کہ اس ملک کے رہنے والے مسلمانوں میں یہ شعور اجاگر کیا جائے کہ بحیثیت امت مسلمہ ہمارا نصب العین کیا ہے اور ہماری انفرادی و اجتماعی مساعی اور جدوجہد کو کس مرکز و محور کے گرد مرکوز ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے یہ آیت مبارکہ ہمارے لئے بہت اہم ہے کہ یہ امت مسلمہ کی غرض تائیس اور اس کا اجتماعی نصب العین بیان کر رہی ہے۔

”شہادت“ کا مفہوم اور دین میں اس کا مقام

اس آیت میں ”شَهِدَ“ کا جو لفظ آیا ہے اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس کا لفظی ترجمہ ”گواہ“ ہے۔ فرمایا گیا: ”ناکہ تم ہو جاؤ گواہ نوبع انسانی پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر“۔ اولین گواہی انسان کے اپنے قول اور زبان سے ہوتی ہے۔ ایک شخص زبان سے اقرار کرتا ہے کہ لَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔۔۔۔۔۔ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“۔۔۔۔۔۔ تو یہ قولی گواہی ہے جس سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر عملی گواہی کا درجہ آتا ہے۔ اور دنیا میں اصلاً وہی گواہی معتبر قرار پاتی ہے جس کی تائید انسان کے عمل سے ہو رہی ہو۔ اگر آپ قولاً ایک بات کا اعلان مگر عملاً اس کی تکذیب کر رہے ہوں تو دنیا اس بات کو معتبر نہیں مانے گی۔ معتبر بات وہی ہوگی جو عمل سے ثابت ہو جائے۔ لہذا قولی شہادت کے ساتھ اس کی عملی گواہی بھی زندگی کے پورے رویے سے لازمی طور پر ملنی چاہئے۔ کلمہ شہادت ادا کرنے سے ہم نے اللہ کے معبود ہونے، مطاع مطلق ہونے، حاکم و مالک ہونے اور خالق و رب ہونے کا اقرار کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانا ہے، انہیں اس کا فرستادہ اور نمائندہ تسلیم کیا ہے۔ اس تصدیق و تسلیم اور عہد و میثاق کی بدولت ہمیں ”نَايِظًا اَلْنَيْنِ اٰمَنُوْا“ سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ لہذا ہم پر لازم ہو گیا کہ ہماری عملی زندگی بھی اس کی شہادت دے اور ہم میں سے ہر فرد عملی طور پر اللہ کا بندہ، غلام اور مطیع فرمان بن جائے۔ اس کی زندگی کا ہر عمل اور فعل اس بات کی گواہی دے رہا ہو کہ یہ شخص خود مختار نہیں ہے، یہ من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں

ہے، یہ زمانہ کے چلن کے ساتھ چلنے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک پابند شخصیت ہے جو چند بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے ایک معین منزل مقصود اور نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اپنی منزل ہی کی سمت میں اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک رخ متعین ہو چکا ہے اور زندگی کے ہر دور اس کے لئے اسے ہدایت دے دی گئی ہے کہ اسے کس راہ پر چلنا ہے اور کس پر نہیں چلنا ہے۔ غرضیکہ اس کے ہر کام اور ہر حرکت کے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ انسان کی عملی زندگی کی اس گواہی سے درحقیقت اس قولی گواہی ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“ کا انفرادی سطح پر حق ادا ہو گا۔

اب اس سے آگے بڑھیے۔ ہماری حیثیت چونکہ محض ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک امت کی ہے، لہذا ہمیں یہ عملی گواہی صرف انفرادی سطح پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی دینی ہوگی۔ اس اعتبار سے جب تک ہماری پوری کی پوری اجتماعی زندگی یعنی ہمارا ملکی نظام، ہمارا آئین و دستور، ہمارے تمام قوانین، ہماری معیشت، معاشرت، تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت غرضیکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے سانچے میں ڈھل نہیں جائے گا اس وقت تک عملی گواہی کا حق ادا نہیں ہو گا۔ اس عملی گواہی کی تکمیل اس وقت ہوگی جب اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام حیات نوع انسانی کو اپنی کامل صورت میں قائم و نافذ نظر آئے، ورنہ امت کتمان حق کی مجرم شمار کی جائے گی۔ اور جو شخص حق کی یہ گواہی دینے کے لئے فقر جان بچاؤ کر دے اسے مالک ارض و سماء کی بارگاہ سے ”شہید“ کا خطاب ملتا ہے اور اس کی گواہی پر ہر تصدیق ثبت کر دی جاتی ہے کہ یہ ہے وہ سچا گواہ جس نے جان کی بازی لگا کر اس بات کی گواہی دے دی کہ اس کائنات کا ایک ہی مالک اور ایک ہی معبود ہے۔ اس نے جان پر کھیل کر دراصل یہ اعلان کیا ہے کہ: **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ، فَلَكَ الْبَلَدُ الْأَعْلَى** کہ اللہ کے سوا اور کسی کو حکم کا اختیار نہیں اور اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو! یہی دینِ قیم ہے، یہی قائم و مستحکم دین ہے!!

لفظ ”شہادت“ کی مندرجہ بالا بحث سے ہمارے دین میں اس کی اہمیت اور اس کا مقام واضح ہوتا ہے۔ شہادت ہی سے ہمارے اسلام کا آغاز ہوا۔ ہم کلمہ شہادت کا اقرار

کر کے امتِ مسلمہ میں شامل ہوئے اور مسلمان قرار پائے۔ اور اب جو ہماری بلند ترین منزل ہو سکتی ہے وہ ”مقامِ شہادت“ ہے، جو اللہ کی راہ میں نقدِ جان کا نذرانہ دے کر حاصل ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

فریضۂ شہادت علی الناس کی اہمیت

بحیثیتِ امتِ مسلمہ ہماری ساری اجتماعی مساعی کا ہدف، ہماری ساری اجتماعی زندگی کا مرکز و محور اور ہماری زندگی کا نصب العین ”شہادتِ حق“ یعنی اللہ کی گواہی دینا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ (آیت ۸) میں ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ

کہ اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے، اللہ کا جھنڈا اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور پوری دنیا کے سامنے عدل و انصاف کی گواہی دو! یہی بات سورۃ النساء (آیت ۱۳۵) میں بایں الفاظ فرمائی گئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ

کہ اے ایمان والو! عدل کے قیام کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو!

پھر یہ گواہی صرف دنیا تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ آخرت میں بھی امتِ مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی پر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر یہ گواہی دینا ہو گی۔ سورۃ النساء (آیت ۴۱) میں فرمایا گیا:

لَكَفَّ إِذَا اجْتَنَبْنِي كُلُّ أُمَّةٍ شَهِيدٌ وَجُنَايَكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدٌ

”پس (غور کرو کہ) اُس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے محمد) ان لوگوں پر ہم آپ کو بحیثیت گواہ کھڑا کریں گے۔“

یعنی ہر امت اور ہر قوم کے نبی اور وہ لوگ کہ جنہوں نے دنیا میں حق کی گواہی دی ہو گی وہ محاسبہِ اخروی کے وقت کھڑے کئے جائیں گے تو وہ گواہِ استقامت (Prosecution)

(Witness) کی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ وہاں اللہ کی عدالت میں وہ گواہی دیں گے اور اس بات کو Testify کریں گے کہ اے پروردگار، تیری جو ہدایت ہم تک پہنچی تھی وہ ہم نے کسی کی بیشی کے بغیر، کسی چیز کو چھپائے بغیر، کسی مصلحت کا لحاظ کئے بغیر، اپنے کسی مفاد اور اپنے جسم و جان کے تحفظ کا خیال رکھے بغیر ان تک پہنچا دی اور اس طرح اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی بلا کم و کاست دے دی اور اس گواہی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ پھر یہی شہادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر دیں گے۔ اس کے بعد پھر افراد کا عمومی محاسبہ ہو گا۔ لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ جو حق تم تک پہنچا دیا گیا تھا، حق کی جو تبلیغ تم تک کر دی گئی تھی اس کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ رہا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و رسل کے لئے ”شاہد“ اور ”شہید“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الزمل میں فرمایا گیا:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ رَسُولًا شَهِدًا عَلَيْكَ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا
فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ لَنَأْخُذَنَّهُ أَخَذَ أَوْيَلًا ۝ لَّكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ
يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمْعُ مَنفُطٌ بِهِمْ كَأَن وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝

”(اے لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، آگاہ ہو جاؤ) بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیج دیا ہے، جیسے کہ ہم نے فرعون کی طرف (حضرت موسیٰ کو) رسول (اور گواہ بنا کر) بھیجا تھا۔ پس فرعون نے (ہمارے) رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے (اسی دنیا میں) اس پر گرفت کی و بال کی گرفت۔ پھر تم کیونکر بچ جاؤ گے اگر تم نے (ہمارے رسول کا) انکار کیا؟ (اور تم کیسے بچو گے) اُس دن سے جو (خوف کے مارے) بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اُس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ بے شک اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہونے والا ہے۔“

سورۃ الاحزاب میں جہاں نبی کریم کی صفات اور ان کا مشن بیان فرمایا گیا تو آپ کی اسی صفت شہادت کو دوسری صفات و اوصاف سے مقدم کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَ مَبَشِّرًا وَ نَذِيرًا ۝ وَ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرًا مُّخْفًى ۝

”اے نبی“ بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاید، مبشر اور نذیر (بنا کر) اور اللہ کی طرف دعوت دینے والا اس کے حکم سے، اور ایک روشن چراغ (بنا کر)۔“
 تو یہ ہے ہمارے دین میں شہادت کا تصور، اور ہر نبی اسی شہادت حق کے لئے بھیجا جاتا تھا اور ہر رسول کی غایتِ بعثت یہی ہوتی تھی۔

شہادتِ حق کا ختمِ نبوت سے تعلق

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کی تکمیل اور اس سلسلہ کے خاتمہ کے بعد اب امتِ محمد (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اجتماعی حیثیت سے پوری نوعِ انسانی کے لئے گواہ بنا کر کھڑی کی گئی ہے۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے دین کی شہادت قولاً اور عملاً، اجتماعی اور انفرادی سطح پر پیش کرے۔ اور یہی درحقیقت اس امت کی غرضِ تاسیس ہے۔ اسی مقصد کے لئے یہ امت برپا کی گئی ہے، اے اللہ کی طرف سے اس کام کے لئے جن لیا گیا ہے، اور بحیثیتِ جماعت یہی اس کا میمورنڈم ہے۔ اس امت کو دنیا کی دوسری اقوام و امم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنے لئے جیتی ہیں، لیکن اسے ان کے لئے جینا ہے، ان کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا ہے اور ان کے سامنے حق کی شہادت کو پیش کرنا ہے۔

امتِ مجتبیٰ

سورہ البقرہ کی آیت زیرِ درس کے علاوہ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کا مقصد وجودِ فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی قرار دیا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: **هُوَ اجْتَبَاكُمْ** ”اس نے تمہیں (اس مقصد کے لئے) چن لیا ہے۔“
 سورۃ الحج کا آخری رکوع ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ارسالی وحی اور انسانوں تک اپنے پیغام کی تبلیغ کے لئے ملائکہ اور انسانوں میں سے بعض کو منتخب فرما لیتا ہے (قُلْهُ) **يَصْطَلِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ** اسی مقام اصطفاۃ پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہیں، چنانچہ آپ کا ایک لقب ”مصلی“ بھی ہے۔ پھر اس فریضہ شہادتِ حق کی

اہمیت مسلمانوں پر واضح کرنے کے لئے ایک دوسرا انداز اور اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَجَاهِدُوا إِلَى اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○

سورۃ الحج کی اس آیہ مبارکہ کا چونکہ ”شہادت حق“ یا ”شہادت علی الناس“ کے موضوع سے گہرا تعلق ہے، لہذا میں چاہتا ہوں کہ ہم اس آیہ کریمہ کا بھی قدرے تشریح و تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر لیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بات جان لیجئے کہ اس آیت میں ”وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ“ سے ”وَفِي هَذَا“ تک ایک جملہ معترضہ ہے، جو اکثر سلسلہ کلام کے درمیان میں آجایا کرتا ہے۔ ربط مضمون کے اعتبار سے ”هُوَ اجْتَبَاكُمْ“ کا براہ راست تعلق ”لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ“ سے جڑتا ہے۔ یعنی تمہیں اس نے چُن لیا ہے، پسند فرمایا ہے، تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم بنی نوع انسان پر گواہ بن جاؤ!

اس آیہ کریمہ کی تشریح و تفسیر سے قبل اس کا ایک رواں ترجمہ، بلکہ ایک ترجمانی ملاحظہ فرمائیں:

”اللہ کے کام میں (In the Cause of Allah) محنت کرو، کوشش کرو، جدوجہد اور کٹکٹش کرو، جیسا کہ اس کی جدوجہد کا حق ہے۔ اس نے تم کو (دوسری اہم و اقوام کے مقابلہ میں اپنے کام کے لئے) چُن لیا ہے۔ اور اس نے تم پر (دین کے احکام میں) کسی قسم کی سبکی بھی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ ہے۔ اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے (نزولِ قرآن سے) پہلے بھی اور اس آخری کتاب میں بھی۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ۔ (یعنی رسول اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت ادا فرما کر تم پر اتمامِ حجت فرمادیں اور تم اپنے قول و عمل سے تاقیامِ قیامت نوعِ انسانی پر شہادتِ حق ادا کر کے حجت قائم

کرتے رہو) پس تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) اقامتِ صلوٰۃ اور ادائیگیِ زکوٰۃ کا نظام قائم رکھو اور اللہ کو (اس کی کتابِ حمید، قرآن مجید کے واسطے سے جو ”حَبْلُ اللّٰہ“ ہے) مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو۔ وہی اللہ تمہارا کارساز اور حامی و ناصر ہے۔ (لہذا مخالفت اور مصائب و مشکلات سے ہر اس سے نہ ہو، تم کو حقیقی ضرر اور نقصان کوئی نہ پہنچا سکے گا۔) پس اللہ تعالیٰ کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی اچھا مددگار ہے!“

سورۃ الحج کی اس آخری آیت کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یہ شہادتِ حق ہی کی ذمہ داری ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی کو اپنا رسول منتخب کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے خاتم النبیین سید المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ مصطفائیت پر فائز فرمائے گئے۔ اور آنحضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد شہادتِ حق کی یہ ذمہ داری تا قیام قیامت امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

امتِ مجتبیٰ کی عظیم ذمہ داریاں

یہ امر مسلم ہے کہ کوئی جس قدر عظیم اور ارفع مرتبے کا حامل ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی قدر رفیع و عظیم ہوتی ہے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ کو مقامِ اجتنائیت پر فائز فرما کر اسے شہادتِ حق کی عظیم ذمہ داری کا حامل بنایا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجتہ الوداع میں ”فَلْيُبَلِّغِ الشَّاعِدَ الْغَيْبَ“ کے الفاظ کے ساتھ یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرمادی۔ یعنی ”جو لوگ یہاں موجود ہیں اب ان کا فرض ہے کہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔“ لہذا اس فرمانِ نبویؐ کے مطابق نوعِ انسانی کے سامنے شہادتِ حق اور تبلیغِ دین حق کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ امتِ محمدیہ کے کاندھوں پر آگیا ہے اور امت کے ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو بحیثیتِ مجموعی اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دینی ہے۔

شہادتِ حق کی یہ عظیم ذمہ داری ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم شعوری طور پر اس کی ادائیگی کے لئے کمر بستہ ہوں، لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ نہ ذمہ داری

چ کا شعور ہے اور نہ مسئولیت کا احساس۔ پھر اس کی ادائیگی کی فکر ہو تو کیسے ہو؟ ہم اس بات سے تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم ”امتِ مرحومہ“ سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیں ”امتِ وسط“ بنایا گیا ہے، ہمیں ”خیر امت“ کا لقب دیا گیا ہے، ہم سید المرسلین اور خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں شامل ہیں۔۔۔۔۔ اور امرِ واقعی کے طور پر یہ ہے بھی خوشی اور مسرت کا مقام۔۔۔۔۔ لیکن افسوس کہ ہم کو اس بات کا بالکل احساس نہیں ہے کہ اس امتِ وسط اور خیر امت میں شامل ہونے کے عزو شرف کے ساتھ ساتھ ہمارے کندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بوجھ بھی آن پڑا ہے اور شہادتِ حق کی اس ذمہ داری کے بارے میں ہمارا احتساب ہو گا۔ بقیہ پوری نوعِ انسانی سے باز پرس بعد میں ہو گی، پہلے ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس حق کو کس طرح ادا کیا؟ تم رسولِ امینؐ کے قائم مقام تھے، تم اللہ کی آخری کتابِ ہدایت کے حامل تھے، تم پہاڑی کا چراغ تھے اور زمین کے نمک تھے۔ تم نے اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دینے کے لئے کیا محنتیں کیں، کتنی جدوجہد کی اور کتنی توانائیاں کھپائیں؟ غلبہٴ دینِ حق کی جدوجہد اور فریضہٴ شہادتِ حق کی ادائیگی میں کتنا مال کھپایا؟ کیا ان سوالوں کا کوئی جواب ہمارے پاس ہے؟ کیا ہم بارگاہِ خداوندی میں اس کا کوئی عذر پیش کر سکیں گے؟ اور خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس محاسبہ سے ہم سب کو لازماً سابقہ پیش آکر رہے گا!

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں شہادتِ حق کا مجاہدہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اس فریضہٴ شہادتِ حق کی ادائیگی کا انداز اور اس کی شان دیکھنے کے لئے آپؐ کا تیسیس سالہ دورِ نبوت نگاہوں کے سامنے لائیے تو معلوم ہو گا کہ اجرائے وحی اور منصبِ نبوت و رسالت پر فائز ہونے کے دن سے حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک حضورؐ کی ساری جدوجہد، کشمکش اور جماد و قتال کا مرکز و محور یہی فریضہٴ شہادتِ حق اور تبلیغِ حق رہا ہے۔ آپؐ کی ساری محنت و مشقت میں یہ احساسِ ذمہ داری غالب رہا ہے کہ لوگوں پر حق کی گواہی دینے اور حق کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ آخرت کی جواب دہی کا یہ احساس اور شہادتِ حق اور تبلیغِ حق کی ذمہ داری کی یہ فکر حضورؐ کو ہمیشہ دامن گیر رہی۔ یہی احساس آپؐ کو مکہ کے کوچہ و بازار

میں لئے لئے پھرتا رہا۔ کبھی گالیوں کی بوچھاڑ کا سامنا ہوا تو کبھی پتھروں کی بارش کا، کہیں طغی و استہزاء کے تیر بر سائے جا رہے ہیں تو کہیں طعن و تشنیع سے جگر چھلنی کیا جا رہا ہے، کہیں گلے میں پھندا ڈال کر جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی حالتِ سجدہ میں پشت اور شانہ مبارک پر نجاست بھری اور جھڑی لادی جا رہی ہے۔ راستے میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے جاں نثاروں کو کہیں تپتی دھوپ میں منہ کے بل گھسیٹا جا رہا ہے، کہیں ان کے سینوں پر آگ دھکائی جا رہی ہے اور کہیں ان کو برہمیوں سے چھیدا جا رہا ہے۔ کبھی آپ اور آپ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کر کے بھوک اور پیاس سے تڑپا کر مار ڈالنے کے منصوبہ پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اور پھر یوم طائف کی سختی کا اندازہ کیجئے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول آپ کی زندگی میں اس سے زیادہ سخت دن کوئی نہیں گذرا۔ طائف کی گلیوں میں اوباش لڑکے پیچھے لگا دیئے گئے ہیں، تسخراڑایا جا رہا ہے، پھبتیاں کسی جا رہی ہیں، پتھروں کی بارش سے جسیم اطہر لولہمان ہے، پائے مبارک میں نعلین اس مقدس خون سے جم گئے ہیں۔ پھر قتل کی تیاریاں ہیں، ہجرت ہے، جوار بیت اللہ سے جدائی کا مرحلہ ہے، غارِ ثور ہے۔ آگے بڑھتے، مدینہ منورہ میں یہودیوں اور منافقوں کی ریشہ دوانیاں ہیں، بدر و احد کے معرکے ہیں۔ میدانِ احد میں اپنے محبوب ساتھیوں کے تڑپتے لاشے ہیں، وہ لوگ جودل سے پیارے تھے، نظروں کے سامنے خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ حمزہ جیسے عزیز چچا، جان نثار رفیق اور دودھ شریک بھائی کا چبایا ہوا جگر اور مثلہ شدہ جسم نگاہوں کے سامنے ہے۔ معصب بن عمیر کا لاشہ سامنے لایا جاتا ہے جس کو کفن تک میسر نہیں آ رہا اور اسے ایک چھوٹی سی چادر میں اس طرح لحد میں اتارا جاتا ہے کہ پاؤں گھاس سے ڈھانپے جاتے ہیں۔۔۔ یہ وہ صالح نوجوان ہے کہ اسلام سے قبل مکہ میں اس سے زیادہ خوبصورت، معطر اور قیمتی لباس پہننے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور یہی وہ جاں نثار صحابی ہیں جنہیں آنحضرتؐ نے بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد قرآن کی تعلیم و تدریس کے لئے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا اور ان کی تبلیغ سے وہ میدان تیار ہوا جس کے نتیجے میں یثرب کو دارالہجرت اور مدینۃ النبیؐ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔۔۔ اسی معرکہ احد میں خود رسول اللہؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے، خود کی کڑیاں رخسارِ مبارک میں اور سرِ مبارک میں پیوست ہوئیں، بے ہوشی کی

کیفیت بھی طاری ہوئی۔

غور کیجئے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کس لئے ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ ایک طرف فریضہ شہادتِ حق کی ذمہ داری کا احساس تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مراحل سے گزار رہا تھا اور دوسری طرف امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آنحضورؐ کا اسوۂ حسنہ نمونہ بننا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ان تمام مراحل سے اسی لئے گزار رہا تھا کہ آپؐ کے نام لیواؤں اور آپؐ سے عقیدت و محبت کے تمام مدعیان کو معلوم ہو جائے کہ خیر امت اور امتِ وسط ہونے کا منصب جہاں ایک مقامِ عز و شرف ہے، وہاں اس مقامِ رفیع کی بڑی کٹھن اور بھاری ذمہ داریاں ہیں، جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے انجام دینا ہوگا، جس کے بغیر محاسبہ آخری سے رستگاری ممکن نہیں۔

فریضہ شہادتِ حق کی امت کی طرف منتقلی

سورۃ البقرہ کی زیر مطالعہ آیت اور سورۃ الحج کی آخری آیتِ کریمہ اس بات کے لئے نصِ قطعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بنی نوعِ انسانی کے سامنے حق کی شہادت دینا امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے اور اسی شہادتِ حق ہی کے لئے یہ امت برپا کی گئی ہے۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کا بھی یہ لازمی تقاضا ہے کہ دنیا کی رشد و ہدایت کا کام امت سرانجام دے اور اپنے قول و فعل سے گواہی دے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذمہ داری جس طور پر امت کی طرف منتقل فرمائی اس کا حوالہ اسی مضمون میں گزر چکا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ خطبہ حجتہ الوداع کے حوالے سے اس بات کی مزید وضاحت کروں کہ حضورؐ نے فریضہ شہادتِ حق کی امت کی طرف منتقلی کا کام کس کمالِ حکمت سے انجام دیا۔ خطبہ حجتہ الوداع کو بجا طور پر حقوقِ انسانی کا ایک منشور اور ہدایتِ ربانی کا ایک خلاصہ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تینیس سال کی مسلسل محنتِ شاقہ اور جاں نسیں مساعی کے بعد جب وہ وقت آیا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک فریضہ شہادتِ حق علی الناس کی تکمیل ہو گئی اور اللہ کا دینِ تمام و کمال غالب ہو گیا تو آپؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں آپؐ نے انتہائی اہم ہدایات ارشاد فرمانے کے بعد مجمع سے سوال کیا: **أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟** کہ لوگو! میں نے خدا کا پیغام، اس کی ہدایت پہنچادی کہ نہیں؟ تبلیغ کا حق ادا ہو گیا کہ نہیں؟ اس پر سوالا کہ صحابہ کرامؓ کا مجمع پکار اٹھا: **قَدْ بَلَّغْتُ لَكَ قَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ** کہ اے اللہ کے رسول! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق تبلیغ ادا کر دیا، حق امانت ادا کر دیا اور حق خیر خواہی ادا کر دیا۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ دریافت فرمائی اور صحابہ کرامؓ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے انگشت مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے فرمایا: **اَللّٰهُمَّ لَشَهَدَ كِهْ اے پروردگار! تو بھی گواہ رہ**، میں سبکدوش ہو گیا، میری ذمہ داری پوری ہوئی! میری طرف سے فریضہ شہادت علی الناس ادا ہو گیا اور تیرا دین بالفعل قائم ہو گیا! اس سوال و جواب کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت حق اور تبلیغ دین کی وہ ذمہ داری جو خاتم النبیین والمرسلین کی حیثیت سے آپؐ کے سپرد تھی صحابہ کرامؓ سے بایں الفاظ مخاطب ہو کر امت کی طرف منتقل فرمادی کہ **فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ** یعنی جو لوگ یہاں موجود ہیں اب یہ ان کا فرض ہے کہ وہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں! اس طرح فریضہ شہادت حق کی ادائیگی کی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں سے امت کے کاندھوں پر منتقل ہو گئی۔ اب امت کے ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو اجتماعی طور پر یہ فریضہ سرانجام دینا ہے۔

عملی جدوجہد کا نقطہ آغاز

سورۃ الحج کی آخری آیت میں امت کا فرض منصبی شہادت علی الناس بیان فرمانے کے فوراً بعد امر کے صیغہ میں امت کو تین احکام دیئے گئے: (۱) **فَاَلْبِسُوا الصَّلَاةَ** (۲) **وَ اتَّوُا الزَّكَاةَ** (۳) **وَ اعْتَصِمُوا بِاللَّيْلِ**۔ ان کے آغاز میں کلمہ ”فی“ (یعنی ”پس“) بہت معنی خیز ہے۔ فرمایا: (۱) پس نماز قائم کرو، (۲) زکوٰۃ ادا کرو، اور (۳) اللہ سے چمٹ جاؤ! اس کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو! اس آخری حکم ”اعتصام باللہ“ کے بارے میں تو بعد میں کچھ عرض کیا جائے گا، پہلے ہم اقامتِ صلوٰۃ اور ایٹائے زکوٰۃ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ ایک انسان کو جب اس کے نصب العین یا ہدف (Target) کا شعور حاصل ہو جائے اور اس کی منزل متعین ہو جائے کہ اسے کہاں پہنچنا ہے تو وہ یکدم ایک ہی جست میں اس ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ سب سے پہلے اسے اپنے سفر کا نقطہ آغاز متعین کرنا ہو گا اور پھر منزل بہ منزل اپنے متناہی مقصود تک پہنچنا ہو گا۔ چنانچہ ”لَا تَقِمْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ“ کے الفاظ میں اس جدوجہد کا نقطہ آغاز بیان فرمایا جا رہا ہے کہ ”شہادت علی الناس“ کے ہدف تک پہنچنے کے لئے سفر کا آغاز اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ہو گا۔ یہ گویا اس ہدف کے ناگزیر لوازم (Pre-requisites) ہیں۔ وہ شخص بڑا ہی نادان ہے جو شہادت حق اور اس سے بھی بڑھ کر اقامتِ دین کے مراحل میں ایک دور دار چھلانگ لگا کر پہنچنا چاہے جب کہ اسے نہ اقامتِ صلوٰۃ کی کوئی فکر ہو اور نہ اوائے زکوٰۃ کی، نہ تو اس کی نماز ہی درست ہو اور نہ ہی اسے زکوٰۃ کے احکام تک معلوم ہوں۔

ہماری بہت سی نادانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فی زمانہ جن لوگوں کو اللہ نے اپنے دین کا کچھ فہم عطا فرمایا ہے اور جن کو یہ شعور حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام محض چند مراسم عبودیت ہی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ دین میں کام کی جو تدریج ہے وہ ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور یہ لوگ جو شغلِ عمل میں اگلی منزل پر چھلانگ لگانے کی سعی لا حاصل میں لگ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ چاروں شانے چت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ قرآن حکیم سے ہمیں یہ راہنمائی حاصل ہو رہی ہے کہ شہادت علی الناس کی منزل کی طرف پیش قدمی کے لئے پہلے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ جیسے فرائض سے تمتک ضروری ہے، اس کے بغیر نہ سیرت کی تعمیر ہوگی اور نہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا ہو گا۔ شریعتِ حقہ میں شخصیت اور معاشرے کی اصلاح کے لئے جو دائرے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان کا لحاظ کئے بغیر آخری دائرے میں جست لگانا مفید مطلب نہیں بلکہ مضر ثابت ہوتا ہے، کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ نظامِ باطل کے خاتمے اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے شاندار جلسے جلوس اور منظم مظاہرے صرف اسی وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جب کہ ان میں حصہ لینے والے ”لَا تَقِمْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ“ پر عامل ہوں۔

اس کے بغیر یہ جلتے جلوس، فلک شکاف نعرے اور مظاہرے گھائے کے سودے ہیں اور ان کی حیثیت فریبِ نفس سے زیادہ نہیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زبردست گرفت اور محاسبے کا باعث بن جائیں۔

اسی طرح جو لوگ بس نماز اور زکوٰۃ ہی کو پورا دین سمجھ بیٹھیں، روزوں کی پابندی، حج کی ادائیگی اور کچھ اور ادو وظائف پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں، جب کہ ان کی زندگی کے دوسرے معاملات اللہ کی اطاعت سے خالی ہوں، نہ دین کی مغلوبیت ان میں کوئی غیرت و حمیت پیدا کرے اور نہ جہاد و قتال کی منازل ان کے سامنے ہوں تو جان لیجئے کہ وہ بھی سخت مغالطے میں ہیں، کیونکہ ان کا تصور دین محدود ہی نہیں مسخ شدہ بھی ہے۔

”اعتصام باللہ“ کا حکم: اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے احکام کے بعد تیسرا حکم ہے: ”وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ“ یعنی اللہ سے مضبوطی کے ساتھ چٹ جاؤ! اس کا دامن مضبوطی سے تھام لو! لفظ ”عصمت“ حفاظت کے معنی میں آتا ہے اور ”اعتصام“ کا مفہوم اپنی حفاظت کے لئے کسی چیز کے ساتھ چٹ جانا یا کسی کا دامن تھام لینا ہے۔ یہاں ”وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ“ کے الفاظ سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے چٹ جانے کا جو حکم یہاں دیا جا رہا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ اللہ سے چٹ جانے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ”الْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا“ کے اصول کے پیش نظر ہمیں اس کی وضاحت سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ملتی ہے، جہاں فرمایا گیا: ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ“ یعنی اللہ کی رسی کے ساتھ چٹ جاؤ! حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لو! اب ”حبل اللہ“ کے مفہوم کی تحقیق کے لئے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، کیونکہ قرآن کی تہمیں و تشریح اور اس کی وضاحت حضورؐ کے ذمہ تھی۔ چنانچہ ایک طویل حدیث کے مطابق جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی عظمت و رفعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ“ کہ یہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔ چنانچہ ”وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ“ کا مفہوم یہ ہو گا کہ قرآن حکیم کو مضبوطی سے تھامو، اس سے اپنا مضبوط تعلق استوار کرو!

خطبہ حجتہ الوداع کے متعلق صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے شہادت لینے اور ”قَلْبِيْلَيْغُ الشَّاهِدِ الْغَلِيْبُ“ کا حکم دینے سے پہلے جو آخری بات فرمائی وہ یہ ہے:

وَقَدْ تَرَكْتُ لَكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ، اِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ، كِتَابُ اللَّهِ
 ”اور یقیناً میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ وہ چیز ہے کتاب اللہ!“

پس عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین جیسے فرائض سے عمدہ برآ ہونے کے لئے ہمارے دست و بازو صلوٰۃ اور زکوٰۃ ہیں اور اس سفر میں ہمارے لئے زاہد راہ، مشعلِ راہ اور ہادی و رہنما اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم ہے، جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ!

فریضہ شہادت علی الناس اور صحابہ کرامؓ کا کردار

اس فریضہ شہادت علی الناس کی انجام دہی میں حضورؐ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ نے جو مصائب و شدائد جھیلے، جو ایثار و قربانی پیش کی اور جو محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں وہ تاریخِ انسانی کا ایک درخشاں باب ہے۔ تاریخِ عالم ان کے صبر و مصابرت اور عزیمت و استقامت کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور قیامت تک عاجز رہے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے خلافتِ راشدہ کی صورت میں اسلام کا جو نظامِ حلالِ اجتماعی قائم کیا وہ انسانیت کی معراج ہے۔ اگرچہ وہ نظامِ خیر و صلاح و فلاح اس وقت اپنی حقیقی شکل و صورت میں دنیا میں عملاً کہیں موجود نہیں ہے، لیکن میں بلا خوفِ تردید عرض کرتا ہوں کہ آج بھی دنیا میں جو خیر، بھلائی اور خوبی کہیں نظر آتی ہے اور جو انسانی اقدار موجود ہیں یا قیامت تک موجود رہیں گی وہ اسی صالح نظام کی برکات ہیں۔ اسی نظام نے انسان کو اس کے حقوق و فرائض کا شعور بخشا، اسی نظام کی بدولت رنگ و نسل اور زبان و وطن کے امتیازات ختم ہوئے، اسی نظام نے خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دیا اور ان کے حقوق دلوائے۔ یہی وجہ ہے کہ ”الفضل مشہدت بہ الاعلہ“ کے

مصدق دشمن بھی اس نظام عدل و قسط کی برکات کے معترف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آنجہانی گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں وزارتوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ اپنی حکومت کے لئے صدیق اکبرؑ اور فاروق اعظمؑ کے دورِ حکومت کو بطور نمونہ سامنے رکھا جائے۔

دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کی صورت میں حق کی عملی شہادت سینہ گیتی پر قائم کر دی گئی جو انسانیت کے لئے ناقیام قیامت میںارۃ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب امت کو قولی شہادت کے ساتھ ساتھ یہی عملی شہادت دنیا کے سامنے پھر پیش کرنا ہے، اس لئے کہ عملی شہادت قائم کئے بغیر شہادت علی الناس کا فریضہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ دنیا پہلے عمل کو دیکھتی ہے لہذا نبوی منہاج پر استوار نظام کی اقامت امت پر فرض ہے۔ اب اگر امت اس فرض سے بحسن و خوبی عمدہ برآ نہیں ہوتی تو وہ لازماً خدا کے ہاں مسئول ہوگی، ازروئے فرمانِ خداوندی: **فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ (الاعراف: ۶)**۔ ”ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی!“

لمحۂ فکریہ

شہادت علی الناس کے اس فریضہ کی ادائیگی کے ضمن میں اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ آج ہمارا کیا حال ہے؟ کیا ہم اس فرض کی انجام دہی کا کوئی احساس رکھتے ہیں؟ کیا ہمیں بحیثیت امت یہ شعور حاصل ہے کہ ہمارے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بار ہے؟ کیا ہمیں بنی نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت کے لئے قولی و عملی شہادت کی کوئی فکر ہے؟ اور اس سے بڑھ کر غور طلب بات یہ کہ دوسروں پر حق کی شہادت قائم کرنے سے پہلے کیا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی ایک گوشے سے بھی اس حق کی کوئی عملی شہادت دی جا رہی ہے؟ یہ بڑی ہی دردناک، المناک اور تلخ حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ حیثیت خزانے کے سانپ کی سی ہے کہ ہم نہ تو خود اس دولتِ ربانی سے مستفیض ہو رہے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے سوءِ عمل اور پستیِ کردار کی وجہ سے دنیا میں ذلت و مسکنت کی جو حسرت انگیز اور عبرت آموز تصویر

بنے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر اسلام کی حقانیت پر کوئی ایمان لائے تو کیسے لائے؟ یہ بڑی ہی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دینے کے بجائے کتمانِ حق کے مجرم بنے ہوئے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں بنی اسرائیل کو 'جو ہم سے پہلے امتِ مسلمہ' کے مقام پر فائز تھے، ذلت و مسکنت کے عذاب سے دوچار کیا گیا تھا اور ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ آج بھی سزا ہمیں مل رہی ہے اور ہم پر تنبیہات کے کوڑے مختلف عذابوں کی شکل میں برس رہے ہیں، لیکن حیف کہ ہماری نگاہوں سے غفلت کے پردے نہیں چھٹ رہے اور ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں۔

یہ ایک فطری قانون ہے، جس سے ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑتا رہتا ہے کہ کوئی چیز جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد کو پورا نہ کرے تو اسے اٹھا کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے، ایسی چیزوں کو سنبھال کر نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر قلم لکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، لیکن جب آپ کا قلم لکھنا بند کر دے اور اس سے اس کا اصل مقصد ہی حاصل نہ ہو رہا ہو تو آپ یقیناً اسے اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیں گے۔ امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ کی تاسیس دنیا میں اس مقصد کے لئے کی جاتی ہے کہ وہ عبادتِ رب کا رویہ اختیار کرے اور شہادتِ حق کا فریضہ انجام دے۔ اب اگر امتِ مسلمہ اپنے مقصد وجود اور غرض تاسیس ہی کو پورا نہ کرے تو اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، وہ راندہ درگاہ بن جاتی ہے، وہ مردودِ بارگاہِ خداوندی ہو جاتی ہے، اسے دھتکار دیا جاتا ہے اور اس پر خدا کی لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال یہود ہیں، جن کے بارے میں فرمایا گیا: **ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْبَلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَلَّوْا بِغَضَبِ مِنَ اللَّهِ** "اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

یہود کو اللہ تعالیٰ کے اسی ضابطے کے تحت اس قدر اہانت آمیز سزا ملی، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انتہائی پیارے تھے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کی طرف سے جتنا لاڈ پیار اس امت کے ساتھ ہوا وہ کسی دوسری امت کے ساتھ نہیں ہوا۔ اللہ نے ان کے لئے صحرا میں بادلوں کا سائبان فراہم فرمایا، ایک چٹان سے بارہ چشمے جاری فرما دیئے، آسمان سے من و سلویٰ نازل فرمایا، فرعون جیسے جابر

بادشاہ نے اس معجزانہ شان کے ساتھ گلو خلاصی کرائی کہ عصائے موسوی کی ضرب سے سمندر نے ان کو راستہ دے دیا اور پانی چٹانوں کی طرح اطراف میں کھڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے انہی احسانات و انعامات کی بنا پر ان کو یہ غرہ پیدا ہو گیا تھا کہ نَعْنُ أَنْزَلْنَا اللَّوْاَاجِبَاؤُہُ کہ ہم تو اللہ کے بڑے چیتے ہیں اور اس کی اولاد کی مانند ہیں! یہ وہ قوم تھی کہ جس میں سینکڑوں نبی تشریف لائے اور ایک وقت کئی کئی نبی موجود رہے (مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی مبعوث فرمایا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کی حیثیت سلسلہ بنی اسرائیل کے خاتم النبیین کی ہے ان کی نبوت کے وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام موجود تھے۔) جس قوم میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے جلیل القدر نبی اور عظیم الشان بادشاہ گزرے، جس قوم کو مسلسل نبوت عطا کی گئی، جس قوم کے لئے شریعت نازل کی گئی اور کئی کتابیں اتاری گئیں، جنہیں تورات کے بعد کتنے ہی صحیفے دیئے گئے، زبور جیسی کتاب عطا کی گئی اور جن کے لئے انجیل جیسی پُر حکمت کتاب نازل کی گئی۔۔۔۔۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سب کے باوجود انہیں اللہ کی نافرمانی کی کیسی کڑی سزا دی گئی۔

بدقسمتی سے آج بھی مغالطہ ہمیں لاحق ہے کہ ہم امت مرحومہ میں شامل ہیں، اللہ کے محبوب نبیؐ کے محبوب امتی ہیں۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ خدا کے ساتھ اگر ہمارا کوئی رشتہ ہے تو اس مقصد کے واسطے سے ہے جس کے تحت ہمیں امتِ وسط اور خیر امت کے خطابات سے نوازا گیا ہے۔ ان خطابات سے عجب پیدا نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ بہت بڑی ذمہ داریوں کے متقاضی ہیں۔ اگر ہم ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے اور اپنے مقصد وجود کو پورا کرنے کی جدوجہد نہیں کریں گے تو ضابطہ خداوندی کے مطابق خس و خاشاک کی طرح بہا دیئے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ پورا ہو رہا ہے۔ جب تک ہم بحیثیت امت اپنے فرض منصبی کو پورا کرنے کی جدوجہد کو شش کرتے رہے ہم دنیا میں سر بلند رہے اور دنیا نے ہماری عظمت و سطوت کا لوہا مانا اور جب سے ہم نے اپنے اس فرض کو پس پشت ڈالا ہم زوال پذیر ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ ہمارے تنزل کو صدیاں بیت گئی ہیں۔ اندلس میں جہاں ہم نے سات سو سال سے زائد تک حکومت کی، ہمارا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ سمرقند، تاشقند اور بخارا جہاں سے حدیث اور فقہ کے بڑے بڑے

ائمہ اٹھے، آج وہ شہر منکرینِ خدا کے قبضہ میں ہیں اور وہاں پر قائم بڑی بڑی مساجد اور درسگاہیں، سیرگاہوں اور یادگاروں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقصور و مغضوب قوم کے ہاتھوں مشرق وسطیٰ میں عربوں کو جس ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا وہ عذاب کا ایک کوڑا ہی تو تھا، جس کے نتیجے میں ہمارا قبلہ اول جو فاروقِ اعظم سے لے کر ۱۹۶۷ء تک ہماری تولیت میں تھا، یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ (اس عرصے میں قریباً ایک صدی مستثنیٰ ہے جس میں بیت المقدس عیسائیوں کی تحویل میں چلا گیا تھا) لیکن یہ سانحہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے ناکافی رہا اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اسی طرح عیش کوشی، دنیا طلبی اور خدا سے بغاوت کی روش پر کمر بستہ ہیں جو صدیوں سے ہماری فطرتِ عامیہ بن چکی ہے۔

خود ملکِ خدا داد پاکستان کا حال دیکھ لیجئے جو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا، لیکن اسلام سے اعراض کے نتیجے میں ہمارا جو حال ہوا ہے اسے ہم نے نگاہِ عبرت سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندوستان میں، جہاں ہم ایک ہزار سال تک حکمران رہے، ہم کس طرح پائمال کئے گئے اور اب تک کئے جا رہے ہیں۔ ہندو کے ہاتھوں شکست اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کا سقوط ہماری تاریخ کا المناک ترین باب ہے۔ وہاں کشت و خون کا جو بازار گرم ہوا اور بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں پر بہیمانہ مظالم کے جو پہاڑ توڑے گئے اور بھائیوں کی شقاوتِ قلبی کا یہ مظاہرہ کہ ان کی ہوس کے ہاتھوں بہنوں کی عصمت کے آگینے چمکا چور ہوئے۔ کیا یہ سب کچھ ہمارے لئے کسی درجہ میں عبرت اور انذار کا باعث بنا؟ کیا ہمارے دل میں رجوع الی اللہ کی تحریک پیدا ہوئی؟ کیا توبہ النصوح کا جذبہ ہمارے دل میں ابھرا؟ کیا ہمیں اپنی حالت کو بدلنے کا احساس ہوا؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور ہمارے لیل و نہار جو پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ اس بچے کچھے پاکستان میں جو فتنے اور عصمتیں عفریتوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں وہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ذلت و رسوائی کا سب سے بڑا نشان مسلمان بن گئے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ ہماری بیٹھوں پر عذابِ الہی کے کوڑے پڑ رہے ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانون اور ضابطے کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اس صورتِ حال میں

اس وقت تک ہرگز کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی جب تک ہم خود اپنے رویے کو نہیں بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ضابطہ ہے کہ: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا أَمَانًا أَنْفُسِهِمْ**۔ ”یقیناً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کو خود نہ بدلے۔“ چنانچہ جب تک ہم اپنے رویے کو تبدیل نہیں کریں گے اور بحیثیت امت اپنے ان فرائض منصبی کا خیال نہیں رکھیں گے جن کے لئے ہمیں امت مسلمہ بنایا گیا ہم اسی صورتحال سے دوچار رہیں گے۔ لہذا ہم میں سے ایک ایک فرد کو شعوری طور پر یہ طے کر لینا چاہئے کہ اس کا مقصد زندگی عبادت رب اور شہادت علی الناس کے فریضہ کی ادائیگی ہے اور یہ مقصد تمام مفادات سے بلند و بالا اور سب پر حاوی ہو گا اور سب سے مقدم رہے گا اور **”إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“** کے مصداق اس کا جینا اور مرنے کا اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ جب تک امت کے ہر فرد کی صلاحیتیں، توانائیاں اور تمام تر جدوجہد اس ایک نکتہ پر مرکوز نہیں ہوگی اس وقت تک یہ صورت حال نہیں بدلے گی۔ یہی سنت اللہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا** ○

أَقُولُ قَوْلِي هَذَا وَاسْتَغْفِرُ اللَّهَ لِي وَلَكُمْ وَلِسُورَةِ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ

مطالباتِ دین

اقامتِ دین

سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳ تا ۱۵ کی روشنی میں

دین کا تیسرا اہم تقاضا

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

دعوتِ بندگی رب اور فریضہ شہادت علی الناس کے بعد جو تیسری بڑی ذمہ داری اس امت کے سپرد کی گئی ہے اس کے لئے قرآنی اصطلاح ”اقامتِ دین“ ہے، یعنی دین کا قیام، دین کا غلبہ، دین کو بحیثیت نظامِ زندگی بالفعل قائم کر دینا۔ اصلاً تو یہ نتیجہ ہے اسی ”عبادتِ رب“ کا، جس سے گفتگو شروع ہوئی تھی، یعنی عبادت کا نتیجہ ”شہادتِ حق“ یا ”شہادت علی الناس“ اور شہادتِ حق کی بلند ترین منزل ”اقامتِ دین“ ہے، لیکن ان تینوں اصطلاحات کو علیحدہ علیحدہ ذہنوں میں محفوظ کرنا اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ فہم دین سے رفتہ رفتہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے مجرد لفظ ”عبادت“ سے ذہن ان دوسری دو ذمہ داریوں تک نہیں پہنچتا جو حقیقت میں لازم و ملزوم ہیں۔ لہذا جب تک اس کے مضمرات کو کھول کر نہ بیان کر دیا جائے کہ اس حج میں یہ پورا درخت پنہاں ہے اس وقت تک ذہن اسی محدود تصورِ عبادت کی گرفت میں رہتا ہے کہ عبادتِ رب کا مقصد محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہے۔ اس محدود تصور سے رستگاری کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں اصطلاحات کو ملحوظ رکھا جائے جو درحقیقت ایک ہی نکتہ ایمان کی تفسیریں ہیں! لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ ”مطالباتِ دین“ کے ضمن میں ان تین اصطلاحات کو ذہن نشین کر لیں کہ یہ تینوں چیزیں فرائضِ دینی میں شامل ہیں اور فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اخروی کے لئے ناگزیر ہیں۔

اقامتِ دین کی گفتگو اصلاً تو ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ الصف کے درس کے ضمن میں آئی ہے، جس کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تعمیلی مقصد یہ ہے کہ جو ہدایت و رہنمائی اور دینِ حق یعنی ضابطہ حیات دے کر آپ بھیجے گئے تھے اسے آپ پوری زندگی کے نظامِ اطاعت پر غالب کر دیں۔ چنانچہ وہاں فرمایا گیا: هُوَ الَّذِي أَوْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کہ وہی ہے اللہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر

بھیجا ہے، یعنی کتاب اور نظام شریعت دونوں دے کر، تاکہ آپ اس ہدایت اور دین حق کو ہر جنس دین پر غالب کر دیں!

قابل غور بات

اب قابل غور بات یہ ہے کہ کیا قرآن کا نزول محض تلاوت کے لئے ہوا ہے؟ یہ صرف زبانی تعریف و توصیف (Lip Service) کے لئے آیا ہے یا محض ایصالِ ثواب کے لئے اتارا گیا ہے؟ نہیں۔۔۔ بلکہ قرآن تو حضور پر اس لئے نازل کیا گیا تھا تاکہ اس کے مطابق نظام زندگی بالفعل قائم ہو اور دنیا کے سامنے اللہ کے دین کا جامع اور کامل نمونہ آجائے۔ از روئے قرآن حکیم حضور کی بعثت کا مقصد یہی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اسی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اور اسی کے لئے محنتیں کرنے، مشقتیں جھیلنے، جانیں کھپانے، قربانیاں دینے، مال خرچ کرنے، غرضیکہ اس راہ میں اپنے جسم و جان کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں لگانے کا مطالبہ ان لوگوں سے بھی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔ لہذا سورۃ الصف میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۝ تَوَكَّلُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَأْمُرُ إِلَيْكُمْ ۖ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝** ”اے ایمان والو! کیا میں تم کو اس تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تم کو عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر پختہ یقین رکھو اور (اس کے دین کو غالب کرنے کے لئے) اس کی راہ میں جہاد اور مجاہدہ کی روش اختیار کرو۔ (اس کے لئے اپنی صلاحیتیں، توانائیاں، جانیں، مال و منال اور اپنے اوقات اللہ کی راہ میں کھاؤ) یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو“ (الصف: ۱۰-۱۱)

آج کی نشست میں اسی مضمون کی وضاحت کے لئے ہم سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کا مطالعہ کریں گے۔ فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ

إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى.....

”اے مسلمانو! اُس (اللہ) نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے از جنس دین وہی جس کی وصیت کی تھی اس نے نوح کو، اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبی) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو“

نوٹ کیجئے کہ ”شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ“ میں جمع مخاطب کی ضمیر استعمال ہوئی ہے، جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کی مخاطب ہر دور اور ہر زمانے کی امت مسلمہ ہے، البتہ ”وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ“ میں واحد مخاطب کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔

تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہے

اس آیہ مبارکہ کے زیر مطالعہ جزو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لئے بطور دین وہی چیز مقرر کی ہے جو اس سے پہلے دیگر جلیل القدر انبیاء و رسل کے لئے مقرر کی تھی۔ آیت کے اس جزو سے ایک ضمنی مضمون یہ نکلتا ہے کہ یہاں جن پانچ انبیاء و رسل (نوح، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ ہے، ان کا انبیاء و رسل کے مابین ایک خصوصی مقام و مرتبہ ہے۔ قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے ”أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ“ (رسولوں میں ایک خاص مرتبہ والے، مقام عزیمت پر فائز رسول) اکثر و بیشتر علماء کا یہی خیال ہے کہ ”أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ“ یہی پانچ رسول ہیں۔ بعض علماء اس فہرست میں حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں، لیکن علماء سلف کی اکثریت کا رجحان انہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ گروہ انبیاء و رسل میں یہ پانچ امتیازی شان کے حامل ہیں۔ ایک بات اس سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ جو دین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی دین حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، اور حضرت عیسیٰ سلام اللہ علیہم کا تھا۔

لفظ ”دین“ کا مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے لفظ ”دین“ کے معانی و مفہیم کو اچھی طرح جان لینا اور سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ لفظ بھی ”عبادت“ اور ”شہادت“ کے الفاظ کی طرح تعلیمات اسلامی میں بڑا اہم اور مرکزی لفظ ہے اور اس کے صحیح اور حقیقی فہم پر ہی قرآن حکیم کی دعوت کا صحیح اور درست مطلب سمجھنا منحصر ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ ”دین“ کا اصل مفہوم جزا و سزا یا بدلہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الفاتحہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے: **مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ** (جزا و سزا بدلے کے دن کا مالک!) اردو کا مشہور محاورہ ہے ”جیسا کرو گے“ ویسا بھرو گے!“ عربی میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے محاورہ بولا جاتا ہے ”کَمَا تَدِينُ تَدَانُ“۔۔۔۔۔ اسی جزا و سزا کے بنیادی تصور سے عربی زبان میں لفظ ”دین“ کے مفہیم میں انتہائی وسعت پیدا ہوتی ہے لیوید غور کرنے سے یہ تمام مفہیم اور وسعتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ظاہرات ہے کہ جزا و سزا کسی ضابطے اور قانون کے تحت ہی ہوتی ہے۔ یعنی ضابطے اور قانون کی پابندی اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے پر انسان جزاء کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی اور نافرمانی سے سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ لہذا اسی لفظ ”دین“ میں جزا و سزا اور بدلے کے ساتھ ساتھ قانون اور ضابطے کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اب قانون اور ضابطے کے تصور کے مقتضیات و لوازم میں کسی مقتن اور کسی مطاع کا تصور بھی شامل ہے۔ یعنی ایسی ہستی کا تصور جو قانون عطا کرنے والی (Law Giver) ہو۔ اب مزید آگے بڑھئے۔ جزا و سزا، قانون و ضابطے اور مقتن و مطاع کے تصورات و مقتضیات میں اطاعت کا تصور ایک ناگزیر لازمہ کی حیثیت سے شامل ہے۔ قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح ”دین“ ان تمام تصورات کے اجتماع سے بنی ہے اور از روئے قرآن اس کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ:

”ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے

کو مطاع، مقتن (Law Giver) اور حاکم مطلق (Sovereign) مان کر

اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ قانون اور

ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے
زندگی بسر کی جائے!

دین کے اس تصور کو اس کی تمام تر کثیت کے ساتھ سامنے رکھیے۔ قرآن مجید سے ہمیں
لفظ دین کا یہی جامع تصور ملتا ہے۔ اس کے لئے اب میں قرآن مجید ہی سے استشہاد کرتا
ہوں۔

دین الملک: سورہ یوسف میں ”دین الملک“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن ہی
سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام قائم
تھا اور حضرت یوسفؑ اس نظام میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ قحط کے دور میں جب
ان کے بھائی دوبارہ غلہ لینے مصر پہنچے اور آپؑ نے اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو اپنے
پاس روکنا چاہا تو اُس وقت مصر میں نظام بادشاہت کا جو قانون رائج تھا اس کے تحت ان
کے لئے اپنے بھائی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک
خصوصی تدبیر فرمائی۔ سورہ یوسف میں ارشاد ہے:

كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِرْعَوْنُ
الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

”اس طرح ہم نے اپنی تدبیر سے یوسفؑ کی تائید کی (یعنی اس کے لئے اپنے
بھائی کو روکنے کا ایک سبب بنا دیا) اُس (یوسف) کا کام یہ نہ تھا کہ بادشاہ
کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا — اِلَّا يَهْدِي
اللَّهُ سُبُلَهُ“

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ بادشاہت کے پورے نظام کو جو بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد پر مصر میں رائج
تھا ”دین الملک“ سے تعبیر کیا گیا۔
دین اللہ: اس وضاحت کو سامنے رکھ کر اب آخری پارے کی مختصر سی سورت ”سورۃ
النصر“ کو اپنے سامنے لائیے:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي
دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ○

”جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو گئی اور (اے نبی!) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔“

اس مقام پر جو ”دین اللہ“ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ دین اللہ کیا ہے؟ دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکم مطلق اور متقن حقیقی تسلیم کر کے اسی کی جزا کی امید رکھتے ہوئے اور اسی کی سزا سے خوف کھاتے ہوئے، صرف اسی کے قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی عطا کردہ شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو سرانجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر اپنی پوری زندگی میں صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت کو لازم کر لیا جائے۔ اسی روئے اور طرز عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا اور قرآن مجید میں اسی کا حکم بایں الفاظ دیا گیا ہے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** اذْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ”اے اہل ایمان (اللہ کی) اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!“

ہر دین غلبہ چاہتا ہے : از روئے قرآن ”دین“ کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین در حقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ چنانچہ انگریز کے دور میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ ”دین انگریز“ تھا۔ وائسرائے ہند کو تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی اور مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی۔ مسلمانوں کو نماز روزے کی اجازت تھی، لیکن دین اسلام غالب نہ تھا۔ اس مفہوم کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ملا کو جو ہے ہند میں مجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

جدید ذہن ”دین“ کو ”مذہب“ کا مترادف سمجھتا ہے اور اسے ایک نجی (پرائیویٹ) معاملہ قرار دیتا ہے۔ بد قسمتی سے پوری دنیا میں اکثر و بیشتر مذہب کا یہی تصور رائج ہو گیا ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ اسلام مذہب نہیں، بلکہ دین ہے۔ خود قرآن حکیم میں فرمایا گیا: **إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ**۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعات عقائد (Dogmas) کو مان لیا جائے اور ان عقائد

کے تحت چند مراسم عبودیت (Rituals) کی انجام دہی اور چند معاشرتی رسوم (Social Customs) کی پابندی کر لی جائے تو مذہب کا تقاضا پورا ہو گیا۔ مذہب کا تعلق واقعہً انسان کی شخصیت، ذاتی اور نجی زندگی ہی سے ہے۔ اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کی تعبیر کے لئے لفظ ”مذہب“ نہ کہیں قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور نہ ہی پورے کے پورے ذخیرہ احادیث میں کہیں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ہر جگہ اصل اصطلاح ”دین“ ہی استعمال ہوئی ہے، جس کا وسیع تر مفہوم و مطلب میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ ہماری بول چال کے حوالے سے آپ اسے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا چاہیں تو اس کے لئے ہماری زبان کی جدید اصطلاح ”نظام حیات“ ہے، جو ادائیگی مفہوم کے اعتبار سے لفظ ”دین“ کے قریب ترین ہے۔

دین جمہورہ ”دین الملک“ اور ”دین اللہ“ جیسی قرآنی اصطلاحات کے بعد اب ”دین جمہور“ کی اصطلاح پر غور کیجئے۔ موجودہ دور میں جب مذہب کو انسانی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ بنا دیا گیا تو دین کے جامع تصور یعنی اس کے نظام حیات ہونے کے تصور کی جگہ خالی ہو گئی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے آپ سے آپ دنیا میں اس تصور اور نظریے نے رواج پا کر قبول عام حاصل کر لیا کہ زندگی کے اجتماعی معاملات، اصول و ضوابط اور معاشرتی نظام ”جمہور“ خود اپنی رائے، اپنی مرضی، اپنی پسند و ناپسند اور اپنے تجربات و مشاہدات کے اعتبار سے طے کریں گے۔ جمہور یا ان کے نمائندے یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز، کیا صحیح ہے اور کیا غلط! ان کے لئے کسی آسمانی شریعت یا ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ پارلیمان کی اکیاون فیصد اکثریت کو ہر بات کے فیصلے کا اختیار مطلق حاصل ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ دو مردوں کی شادی کے جواز کا قانون پاس کر دے، جیسا کہ فی الواقع برطانوی پارلیمان نے کیا۔ وہ چاہے تو سڑکوں پر، پارکوں، کلبوں اور بازاروں میں، فلموں اور ڈراموں میں اور اسٹیج پر عریانی، مادر زاد برہنگی، حتیٰ کہ جنسی فعل تک کو جائز قرار دے دے، جیسا کہ بعض یورپی ممالک اور امریکی ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی تدغین نہیں ہے، بلکہ اس شیطانی عمل کو قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ اسی طرح پارلیمان چاہے تو قمار بازی، سٹہ، لائری اور اسی قبیل کے منکرات

کو تفریح کا مقام دے کر انہیں قانونی طور پر جائز قرار دے دے، جیسا کہ فی الواقع دنیا کے اکثر ممالک نے کر رکھا ہے۔ شراب نوشی، جنسی بے راہ روی، زنا، عمل قوم لوط، عریانی، قمار بازی، غرضیکہ کوئی شیطانی عمل ایسا نہیں کہ جس کو سید جواز دینے کے لئے جمہور کے نمائندوں کی اکیاون فیصد اکثریت مجاز نہ ہو۔ قانون سازی اور حدود و تعزیرات کی محبین کسی اخلاقی قدر اور آسمانی ہدایت کی پابند نہیں بلکہ اس کے لئے معیار جمہور کی پسند اور ناپسند ہے۔ انہیں اس میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کا بھی پورا حق حاصل ہے۔ اس طرز فکر اور نظریے کے لئے ایک اصطلاح ”سیکولرازم“ یعنی لادینی نظام حیات وضع ہوئی اور آج اسی فکر کا ساری دنیا میں غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ ہم پاکستانی بھی، جنہوں نے نظام اسلامی کے قیام کے لئے تحریک پاکستان چلائی تھی اور پاکستان قائم کیا تھا، اپنی روح کے اعتبار سے اسی نظام حیات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر چاہے ہم ابھی اس طرز فکر کی پوری نقالی نہ کر رہے ہوں لیکن فکری طور پر اسی نظریہ کا ہم پر کامل غلبہ و استیلاء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہدایت اور شریعت سے آزادیہ ”جمہوریت“ نہ صرف ایک لعنت ہے، بلکہ خدا سے بغاوت ہے، سرا سر معصیت ہے، طغیان اور سرکشی ہے اور فکر سے لے کر عمل تک بالکل کفر و شرک ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا اور جو خاتم النبیین و المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل پذیر ہوا، اس کے نزول کا مقصد اس دین اللہ کا بالفعل قیام ہے۔ یعنی اللہ کا دین بالفعل قائم ہو اور تمام معاملات اس کے مطابق طے ہوں، تمام امور کا تصفیہ اسی کی روشنی میں کیا جائے۔ کسی شے کو حلال یا حرام اور جائز یا ناجائز قرار دینے کا مختار و مجاز صرف اور صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے اور اس سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔

دین اور شریعت کا فرق

اس موقع پر ایک اشکال آپ سے آپ ذہن میں آتا ہے کہ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی شریعت اور ہے۔ ان دونوں شریعتوں کا فرق تو ہمیں معلوم ہے، اس لئے کہ تورات منحرف صورت میں ہی سہی، موجود ہے اور قرآن مجید اور سنت رسولؐ بھی تمام و کمال محفوظ ہے۔ الہتہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفے اور ان کی شریعتیں موجود نہیں ہیں۔ لہذا شریعت محمدیؐ اور شریعت موسویؑ کے مابین فرق آج بھی یقین کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد اور اوقات میں اور روزہ کے احکام میں فرق بہت واضح ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو چیز مشترک ہے وہ کوئی اور چیز ہے اور جس میں باہمی فرق ہے وہ مختلف چیز ہے۔ ان دونوں کے لئے دو مختلف اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ ایک کا نام ”دین“ اور دوسری کا نام ”شریعت“ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کسی دور میں بھی قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ دین یہ ہے کہ عقیدہ توحید کے مقتضیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا جائے، اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و رسل اور اس کی اتاری ہوئی کتابوں کی تصدیق کی جائے، ملائکہ، بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر پختہ یقین رکھا جائے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاکم مطلق اور مقنن حقیقی تسلیم کیا جائے۔ جبکہ شریعت عملی زندگی کے احکام پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ حالات کے بدلنے، انسانی ذہن کے ارتقاء اور تہذیب و تمدن اور وسائل و ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ احکام شریعت میں تغیر و تبدل ہوتا رہا، تا آنکہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اور وہ ”اسلام“ ہے، ”ازروئے الفاظ قرآنی: اِنَّ الدِّينَ هُنَا الْاِسْلَامُ۔“ کہ دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے!

دین اور شریعت کے فرق کو آپ دورِ جدید کی دو اصطلاحوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کا ایک تو ”اساسی دستور“ ہوتا ہے، جس میں یہ متعین ہوتا ہے کہ حاکم کون ہے، حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے اور وہ حاکمیت کس طرح استعمال (Channelize) ہوگی۔ حاکمیت کے تحت قانون بنانے کا طریقہ (Process) کیا ہوگا، وہ حاکمیت کیسے رو بہ عمل (Exercise) ہوگی، قوانین میں رد و بدل کیسے ہوگا،

ملکی انتظام کیسے چلے گا، عدلیہ اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کا باہمی ربط کیا ہوگا، اور ایک دوسرے کے لئے احتساب و محاسبہ اور ان میں باہمی توازن (Checks And Balances) کا نظام کیا ہوگا؟ اساسی دستور ان تمام مسائل پر محیط ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کا دستور بناتے ہوئے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی اساسی دفعات بہت پائیدار اور مستحکم ہوں۔ چونکہ ان میں بار بار کی تبدیلی مناسب نہیں ہوتی اس لئے اس میں تبدیلی کے طریق کار کو بڑا ہی مشکل رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس اساسی دستور کے تحت جو قوانین بننے رہتے ہیں ان کا معاملہ دوسرا ہے۔ تعزیرات علیحدہ لکھی جاتی اور طے کی جاتی ہیں، دیوانی اور فوجداری قوانین علیحدہ مدون کئے جاتے ہیں اور ان میں ملکی دستور کے تحت حسب ضرورت آسانی سے ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو آرڈینیمنس (Ordinances) کے ذریعے سے بھی قوانین میں ردوبدل ہو جاتا ہے، لیکن جمہوری ممالک میں تو بہر حال یہ اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہوتا ہے کہ وہ ۳۹ اور ۵۱ کے فرق سے قانون بنا بھی سکتی ہے اور اس میں ردوبدل بھی کر سکتی ہے۔ تو اس کو یوں سمجھئے کہ ہمارے دین کے نظام میں دستور کی جگہ تو ”دین“ کی اصطلاح ہے اور قانون کی جگہ ”شریعت“ کی اصطلاح ہے۔ دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا، مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح رو بہ عمل آئے گی؟ یعنی یہ کس کے واسطے سے ہوگی، حاکم مطلق کے نمائندے کی حیثیت کسے حاصل ہوگی؟ یہ تمام امور ہمیشہ سے طے شدہ ہیں اور ان میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا کہ مطاع مطلق اور حاکم مطلق صرف اللہ ہے جو ”إِنِّي أَنصُرُكُمْ إِلَّا لِلَّهِ“ کی شان کا حامل ہے۔ اس کی طرف سے ملنے والا ہر قانون واجب العمل ہے اور اسے لے کر آنے والے نمائندے اس کے رسول ہیں۔ اس کے قانون کی جو تعبیر (Interpretation) اس کا نمائندہ (یعنی رسول) کرے اسے قبول کرنا اور اس کی روشنی میں اپنے معاملات طے کرنا لازمی ہے۔ جن معاملات میں قرآن و حدیث کی کوئی نکتہ قطعی موجود نہ ہو انہیں دین کی روح کے تحت باہمی مشاورت سے طے کیا جاسکتا ہے، لیکن جو حدود و قیود اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کر دی گئی ہیں ان سے سیرمو

ہئے یا اس میں رد و بدل کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے آیت کے اس حصے کی شرح کہ:
 شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَاللَّهُ أَوْحَيْنَا
 إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَهَارُونَ.....

اقامتِ دین کا حکم

آیت کے اگلے کھڑے میں اب وہ اصطلاح وارد ہو رہی ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا عنوان ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ہمیں کس لئے دیا گیا ہے؟ کیا اس لئے کہ تم اللہ کی عطا کردہ کتاب دستور کو محض حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنا لو؟ اس کا احترام بس اس طرح سے کر لو کہ اسے ریشی جزدان میں پیٹ کر رکھ لو اور ہاتھ سے گر جائے تو اس کے برابر نانچ تول کر دے دو؟ کہیں کوئی تقریب ہو، چاہے وہ کسی سینما، کلب، بار، نانچ گھریا ریس کورس کی افتتاحی تقریب ہو، تو اس کی تلاوت کر لو؟ معاذ اللہ! ایسا ہرگز نہیں! بلکہ یہ دین تو محض اس لئے دیا گیا ہے کہ:
 اَنْ اٰمِنُوْا الدِّیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا فِتْنًا

”کہ اس دین کو قائم کرو اور اس باب میں تفرقہ کا شکار نہ ہو جاؤ!“

یہ دین اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دستور اور قانون ہے معنی ہے جو کہیں نافذ نہیں۔ ہمارے ملک کے ۱۹۷۳ اور ۱۹۷۶ء کے جو دستور رکھے ہوئے ہیں کیا وہ واقعی دستور کہلائے جاسکتے ہیں، جبکہ وہ نافذ ہی نہیں۔ یہ تو بس ہماری تاریخ کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ کوئی دستور صحیح معنوں میں اسی وقت دستور کہلا سکتا ہے جبکہ وہ نافذ بھی ہو۔ قانون اسی کو کہا جائے گا جس کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہو رہے ہوں۔

طرفہ تماشا

یہ عجب طرفہ تماشا ہے کہ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے نام سے جو قوم بس رہی ہے وہ دعویٰ تو اس بات کا کرتی ہے کہ اصل دستور اور قانون خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے، لیکن یہ عجیب شجرِ گرجی ہے کہ ان کا عمل اس دعویٰ

کے بالکل برعکس ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا عطا کردہ دستور و قانون ان کی عملی و اجتماعی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاں قرآن و سنت کے اوامر و نواہی کی سرے سے کوئی وقعت ہی نہیں، لہذا کوئی فیصلہ اس کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ قرآن کا استعمال بس حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے، جبکہ وہ قرآن حکیم کے ضابطہ حیات اور پوری زندگی کے لئے کامل ہدایت و رہنمائی ہونے کے دعویدار بھی ہیں۔ مسلمان قوم کے اس طرزِ عمل کو ایک عجوبہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ سورۃ الرعد میں مکررین قیامت کا ایک اعتراض نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ إِذَا كُنَّا بُرَاثًا ۖ إِنَّا لَنَلِيْ

خَلْقٍ جَدِيدٍ (آیت ۵)

یعنی اگر تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قائل تو ان کی یہ بات ہے کہ آیا جب ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا! لہذا اگر دنیا کو کسی بات پر تعجب کرنا چاہیے تو وہ ہمارا یہ طرزِ عمل ہے کہ ایک طرف تو ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا دستور، ہمارا قانون اور ہمارا ضابطہ حیات اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل ہے، چنانچہ دنیا کے تمام قوانین و دساتیر سے افضل ترین ہے۔ پھر ہم یہ بھی برملا کہتے ہیں کہ اسی پر عمل پیرا ہونے سے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح اور خیر و صلاح حاصل ہو سکتی ہے، لیکن دوسری طرف اس کامل ترین اور افضل ترین دستورِ حیات سے ہماری بے اعتنائی اور مروجہ گردانی بھی دنیا سے مخفی نہیں ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہ بھی کہا گیا تھا کہ ”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ میں ان کو بتا دیتا چاہتا ہوں کہ ہمارا دستور تو چودہ سو سال پہلے سے طے شدہ ہے!“ — لیکن عملاً جو کچھ اب تک ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ قائلِ تعجب بات کیا ہوگی کہ جو ملک اس اصول پر قائم ہوا تھا کہ اس کا دستور اور ضابطہ حیات کتاب و سنت ہوگا اس ملک میں پوری چوتھائی صدی بیت جانے کے بعد بھی اس دستور کی تنفیذ و نفاذ کا مرحلہ روزِ اول سے بھی بعید نظر آ رہا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ معاملہ اتنا بعید نہیں تھا جتنا آج ہے، حالانکہ یہاں بڑے سب مسلمان

ہیں۔ سب کے سب قرآن حکیم پر ایمان کے مدعی بھی ہیں اور اسے اپنا دستور، قانون اور ضابطہ حیات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن میں ہمارے لئے یہ حکم موجود ہے کہ اَنْ اَقِمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ

”اقامت“ کا مفہوم

”اَقِمُوا الدِّينَ“ کا ترجمہ ”قائم کرنا“ بھی کیا گیا ہے اور ”قائم رکھنا“ بھی۔ نتیجے کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دین پہلے سے قائم اور غالب ہے تو اس کو اس حالت پر برقرار رکھنا اقامت دین ہے۔ لیکن اگر دین بالفعل قائم نہیں ہے تو اسے دنیا میں قائم اور غالب کرنے کی جدوجہد کرنا اقامت دین کا تقاضا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ”اقامت“ کا معنی ”سیدھا رکھنا“ ہے، یعنی حکم دیا جا رہا ہے کہ اس دین میں کبھی نہ کرو، اس کی کسی چیز کو بدلو نہیں! تمہیں اس میں کسی کی بیشی اور ترمیم کا اختیار حاصل نہیں، یہ دین تمہیں بطور امانت دیا گیا ہے اور اس کو جوں کا توں رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے! ٹھیک ہے، ”اقامت دین“ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، لیکن سیدھی سی بات ہے کہ اسے جوں کا توں رکھنا کس مقصد کے لئے ہوگا؟ اسے صرف کتابوں میں محفوظ کر لینا یا صرف آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھنا تو مقصود نہیں ہے۔ اس کو محض اپنے نسلی حفیہ کے طور پر مقدس یادگار بنا کر تو نہیں رکھنا ہے۔ بلکہ اگر یہ دین زندگی کے معاملات سے متعلق ہے تو اس کی حفاظت بھی اس کو قائم کرنے کے لئے مقصود ہے، تاکہ تمام معاملات اللہ کی مرضی کے مطابق طے پائیں۔ چنانچہ اَنْ اَقِمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ کا منشا و مفہوم یہ ہوگا کہ دین کو قائم کرو، اس کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کرو، اور اپنے سارے معاملات اس کے مطابق طے کرو اور اس امر میں تمہارے مابین تفرقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں اختلاف کی نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی اجازت!

فقہی اختلافات، تفرقہ نہیں

فقہی جزئیات اور فروعات میں خفی اور شافعی یا دوسرے ائمہ فقہاء کی آراء میں

کس فرق ہے تو یہ دین کا فرق نہیں، بلکہ صرف شریعت اور قانون کی تعبیر میں آراء کا فرق ہے۔ دین تو ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے مابین اختلاف امر محال ہے۔ یہ اختلاف تو جملہ انبیاء و رسل کے مابین بھی نہیں بلکہ سب کا دین ایک ہی ہے اور یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطاع مطلق اور مالک حقیقی ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق ہے اور حاکمیت کا حق بھی اسی کا ہے **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ**۔ ہمارا کام اللہ کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہے۔ اللہ کا عطا کردہ دستور و قانون ہم تک اس کے نبی کی وساطت سے پہنچا ہے۔ چنانچہ ہمارا کلمہ دو اجزاء پر مشتمل ہے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ** رسول کی حیثیت اللہ کے نمائندے اور اس کے بندوں کے درمیان رابطے کی ہے۔ چنانچہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ**۔ پس اس معاملہ میں سرے سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، اس میں تفرقہ ڈالنے، اس کے بارے میں اختلاف کا شکار ہونے، اور اس میں اپنی رائے سے جدا گانہ راہیں نکالنے سے یہ کہہ کر منع فرمایا گیا کہ **أَنْ أَتَمُوا الْفِتْنُ وَلَا تَنفَرُوا فِرْقًا**

دین حق کا قیام مشرکین پر بھاری ہے

اس کے بعد یہ بات فرمائی گئی:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ

”(اے نبی) مشرکوں پر یہ بات بہت بھاری ہے جس کی آپ انہیں دعوت

دے رہے ہیں!“

مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق یہاں پر خطاب اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن درحقیقت ہر دور کے مسلمان اس کے مخاطب ہیں، جو اس دعوت کے داعی

بن کر کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضورؐ کے نقش قدم پر چلنے والے داعیانِ دین اور علمبردارانِ حق سب ہی اس کے مخاطب ہیں۔ یہاں یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ کلمہ توحید جو تمہاری دعوت کی بنیاد ہے، بظاہر بڑا ہی بے ضرر سا کلمہ ہے، لیکن اس کے جو لوازم ہیں، اس کے جو مقتضیات و مقتضیات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو شرک پر کاربند ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کی ضرب ان کے مفادات پر کہاں کہاں پڑے گی۔ ایک سادہ لوح مسلمان کے علم میں شاید یہ بات نہ ہو کہ توحید کی زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے لیکن مشرکین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لہذا ان کے لئے یہ دعوت بہت بھاری ہے اور وہ ٹھنڈے پیٹوں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔

نظامِ شرک

اس موضوع پر مفصل گفتگو تو قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں سورہ لقمان کے دوسرے رکوع اور سورہ الحج کے آخری رکوع کے درسوں کے ضمن میں ہوتی ہے۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ شرک کی دنیا میں ہمیشہ دو نظام رہے ہیں، ایک سیاسی استحصال اور دوسرا معاشی استحصال۔۔۔۔۔ اور ان دونوں استحصالی نظاموں نے ہمیشہ مذہب اور دھرم کا لبادہ اوڑھے رکھا ہے۔

سیاسی شرک اس کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ کوئی انسان خود خدائی کا دعویدار بن بیٹھے کہ مرضی میری چلے گی، میں نہیں جانتا کہ خدا کا کیا حکم ہے اور رسول کیا کہتا ہے، اقتدار کا مالک میں ہوں لہذا حکم صرف میرا چلے گا! اس سیاسی شرک کا نام ملوکیت اور آمریت ہے جس پر کسی قدر گفتگو ”دین الملک“ کی بحث میں ہو چکی۔ اس کی بدترین مثال فرعون اور نمود نے قائم کی۔ سیاسی شرک کی دوسری صورت جو موجودہ دور میں بہت عام ہے، یہ ہے کہ کسی ملک کے عوام اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا انکار کر دیں اور یہ کہیں کہ خدا اور رسول کو ماننا ایک فحی معاملہ ہے۔ جو انہیں مانتے ہیں وہ مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں میں ان کا حکم چلائیں، باقی رہا ملک کا قانون تو وہ عوام کی اکثریت کی مرضی کے مطابق بننا چاہیے۔ اس کا نام ہے جمہوریت، جس پر میں ”دینِ جمہور“ کے

ضمن میں کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔ یہ جمہوریت بھی اسی طرح کا بدترین شرک ہے جس طرح ملوکیت اور آمریت ہے۔ سیاسی شرک کی تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایک قوم حکومت کی مذہبی بن کر دوسری قوم کو محکوم بنالے کہ ہم تمہارے آقا ہیں، لہذا مرضی ہماری چلے گی۔ جیسے انگریز قوم نے ہمیں اپنا محکوم بنا کر ہمارے ساتھ یہ طرز عمل روا رکھا تھا۔ انہوں نے بس اس قدر مذہبی آزادی دے رکھی تھی کہ ہم نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اپنے دین کے مطابق کر لیں، لیکن ملکی قانون (Law of the Land) ان کا تھا۔ مرضی اور پسند تاج برطانیہ کی چلتی تھی اور وائسرائے ہند اس کا نمائندہ تھا۔ گویا تاج برطانیہ ”اللہ“ تھا اور وائسرائے اس کا ”رسول“ تھا۔ یہ سیاسی شرک کی تیسری صورت ہے۔ چنانچہ سیاسی طور پر کوئی آمر، کوئی بادشاہ، یا کوئی قوم حاکمیت کے مقام پر فائز ہو جائے اور ملک کے تمام معاشی ذرائع و وسائل اور تمام قومی دولت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق استعمال کرے تو یہ سیاسی شرک ہے۔

مذہبی شرک۔ یہ سیاسی شرک ہی کی ایک عظیم فرع ہے، جس کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چند بڑے ہوشیار اور چالاک لوگ دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر استھان اور مندر بنا کر یا اولیاء و صلحاء کے نام پر مقبرے، نیکیے اور درگاہیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ ان کے نام پر جو نذرانے آئیں، نذریں اور نیازیں چڑھائی جائیں ان سے ان کے حلوے مانڈے چلتے رہیں اور خواہشات نفس پوری ہوتی رہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں خوش کر دے تو یہ دیوی دیوتا تم سے راضی ہو جائیں گے اور یہ بزرگ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس طرح تمہاری دنیوی مرادیں بھی بر آئیں گی اور خدا بھی تم سے خوش ہو جائے گا۔

یہ در حقیقت انسانوں کا خون چوسنے کے سیاسی اور مذہبی طریقے ہیں جو ہمیشہ سے دنیا میں جاری رہے ہیں۔ ایک طرف بادشاہ لوگوں کی گردلوں پر مسلط ہو کر ان سے خراج وصول کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس طرح کے چالاک اور ہوشیار لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان سے نذرانے وصول کرتے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ کیسے برداشت کر لیں گے کہ اللہ کی توحید کا شہو ہو اور توحید باری تعالیٰ پر مبنی نظام عدلی اجتماعی قائم ہو جائے۔ اسی لئے فرمایا گیا: **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا كَانُوا يُعْمَلُونَ** کہ

مشرکوں پر وہ چیز بہت بھاری ہے جس کی دعوت (اے نبی) آپ انہیں دیتے ہیں! سیاسی اور مذہبی مشرکین میں تعاون: مشرکین صرف خود ہی شرک نہیں کرتے بلکہ نظام شرک کے استحکام کے لئے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون (Joint Hand) بھی کرتے ہیں۔ مشرک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ایک شرک دوسرے شرک کو انگیز بھی کرتا ہے، لیکن اہل شرک توحید کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کا باہمی گٹھ جوڑ ہوتا ہے کہ کوئی سورج دیوتا کا مندر بنالے، کوئی چاند دیوتا کا اور کوئی خود خدائی کا یا خدا کے اوتار ہونے کا دعویٰ کرے اور ”نصف لی و نصف لک“ ہذا قوم جاہلون“ کے صدق دونوں طرف سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹا جائے۔ چنانچہ بے چارے عوام الناس ایک طرف تو بادشاہ کو ٹیکس اور خراج ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف پنڈت، پروہت، پوپ، پجاری اور پیر صاحب ان سے اپنے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ دونوں طرف سے تعاون اور خیر سگالی کے طور پر ایک دوسرے کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی طرف سے ان مذہبی پیشواؤں کو خطابات سے نوازا جاتا ہے اور ان کی طرف سے بادشاہ کو خطابات و القاب دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ پوپ کی طرف سے ”بادشاہ کے مقدس حق حکمرانی“ (Divine Right of the King) کو تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ پوپ کے تقدس کے اظہار کے لئے اسے ”His Holiness“ جیسے بڑے بڑے القاب سے نوازتا ہے۔ پروہت اور پنڈت، حکمرانوں کا سلسلہ نسب دیوی دیوتاؤں سے قائم رکھتے ہیں اور بادشاہ سلامت اپنی اطاعت کے ساتھ ان پنڈتوں، پجاریوں اور پروہتوں کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں۔ غرضیکہ شرک کے یہ دونوں نظام باہمی گٹھ جوڑ سے ایک دوسرے کو قوت فراہم کرتے ہیں۔ لہذا ان میں سے کوئی بھی توحید کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے ان کی زرگری کی جڑ کٹتی ہے، مفادات ختم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت مشرکین پر بہت بھاری اور گراں گزرتی ہے

مصلح اور رسول کی دعوت کا فرق

یہاں یہ بات بھی وضاحت سے سمجھ لیجئے کہ ایک رسول اور مصلح کی دعوت میں بڑا بنیادی

فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف واعظ اور معلم اخلاق بن کر کھڑا ہو تو اس کی بات لوگوں پر اتنی گراں نہیں گزرتی جتنی اُس شخص کی بات جو اس بات کا داعی بن کر اٹھے کہ میں اس پورے نظامِ باطل کو جو غیر اللہ کی اطاعت پر قائم ہے اور جس کی اساس شرک پر ہے، بالکل نیست و نابود کروں گا اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کروں گا۔ یہ دعوت محض بچوں برداشت نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہ غیر اللہ کی اطاعت اور شرکانہ بنیادوں پر قائم نظامِ باطل سے کچھ لوگوں کے سیاسی و معاشی مفادات اور مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ بیچ در بیچ ایسے بندہوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام ٹپٹ ہوا تو یہ سب کچھ بدل جائے گا، بہت سے اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر ہو جائیں گے۔ اس طرح ہمارے مفادات پر ضرب پڑے گی اور ہماری سیاست و چودھراہٹ ختم ہو جائے گی، ہمارا وقار اور احترام خاک میں مل جائے گا، ہمارا اعتماد جاتا رہے گا۔ اس لئے توحید پر مبنی اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کے قیام کی دعوت شرکانہ نظام کے مقتدروں، سرداروں اور مستوں کو کبھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر آپ کسی جزوی اصلاح کی دعوت لے کر اٹھیں، ریفارمر کی حیثیت اختیار کریں یا دین کی محض وہ باتیں پیش کریں جن سے کسی کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو پھر آپ کی کسی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوگی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو پھولوں کے پار پھنائے جائیں، آپ کا شاندار استقبال کیا جائے اور آپ کی خدمت میں سپانے پیش کئے جائیں۔

اہل ایمان کو تسلی

آگے فرمایا:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَن يَّشَاءُ وَ يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَن يُّنِيبُ ۝

”اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف بھیج لیتا ہے اور اپنی طرف (یعنی اپنے دین

پر) آنے کا راستہ اس پر کھول دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔“

آیتِ کریمہ کے اس ٹکڑے کے پس منظر میں اس پوری کشمکش اور پورے تصادم کی جھلک نظر آتی ہے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے سلسلے میں اللہ کے نبی اور مشرکین کے درمیان چل رہا ہے۔ مشرکین کو کسی درجہ میں یہ گوارا نہیں کہ یہ شرکانہ نظام ختم

ہو جائے اور پوری کی پوری زندگی ایک اللہ کی اطاعت کے نظام کے تحت آجائے۔ چنانچہ وہ مزاحمت اور مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہ دین حق کا یہ چراغ کھل کر دیا جائے۔ ان انتہائی مایوس کن حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس شدید مزاحمت و مخالفت اور تشدد سے دل برداشتہ نہ ہوں، اللہ تعالیٰ یقیناً راستہ کھولے گا اور بہت سے لوگوں کو جنہیں وہ چاہے گا اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں میں ذرا بھی ایجابت ہے جو حق کے طالب اور جو یا ہیں، ان کو بھی راہ ہدایت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ اس اجنباء اور ہدایت الی اللہ کی جھلک مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے دیکھ چکے تھے اور اس کے بعد بھی اس کے مناظر ان کے سامنے آتے رہے۔

”اجنباء“ کی مثالیں

اجنباء کا صحیح مفہوم ہے کسی کو کسی مقصد کے لئے پسند کر لینا، جن لینا اور کھینچ لینا۔ یہاں جو فرمایا گیا اللہ یَجْتَبِی الْاَبْرَارَ مَنْ تَشَاءُ (اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے!) اس مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے: ”اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے دین کی خدمت کے لئے پسند کر لیتا ہے، جن لینا ہے!“ اس اجنباء کی دو درخشاں مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلی مثال حضرت حمزہ بن عبد المطلب کا قبول اسلام ہے۔ آنجنابؑ توحید و شرک کی کشمکش سے بے نیاز روز و شب اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شوق حیران دازی اور شکار کا تھا۔ علی الصبح تیر کمان لے کر شکار کو نکل جاتا اور شام کو واپس آتا ان کا معمول تھا۔ ایک روز ابو جہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادتی کی اور یہ زیادتیاں اُس وقت اس کے معمول میں شامل ہو چکی تھیں۔ شام کو واپس لوٹے تو ان کی ایک لونڈی نے انہیں اس زیادتی کا ماجرا سنایا۔ قرابت داری کے جذبے نے جوش کھایا اور اسی وقت جا کر اپنی کمان ابو جہل کے سر پر دے ماری۔ یہی جذبہ ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذریعہ بن گیا اور حمزہ ابن عبد المطلب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں میں شامل ہو گئے۔ آپؐ بارگاہ نبویؐ سے ”اَسَدُ اللہ و

آئندہ رسولؐ اور ”سید الشہداء“ کے القابات سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاه۔

دوسری درخشاں مثال حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اشخاص کے متعلق یہ دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ! عمر ابن الخطاب یا عمرو ابن ہشام (ابو جہل) میں سے کسی ایک کو شرف قبولیت عطا فرما! اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کو چن لیا اور وہ عمر فاروقؓ بن گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاه۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کی طبیعت میں غور و فکر کا کوئی مادہ، تلاش حق کا کوئی داعیہ یا کوئی ایسی علامت دکھائی نہ دیتی تھی جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہو کہ وہ خود سید مہمی اور حقیقی راہ کے جویا تھے۔ بلکہ طبیعت میں لا ابالی پن اور بے پرواہی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق دیتے ہوئے چھ برس گزر چکے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگے، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر تعصب سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت اور آپؐ کی دعوت سے بیزاری بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ تنگی تلوار لے کر آنحضرتؐ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ پھر دل موم ہو گیا۔ وہ عمرؓ جو نبی اکرمؐ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے غلامانِ محمدؐ میں شامل ہو گئے اور ان کی یہ شان قرار پائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو کان بعدی نبی لکان عمرو بن الخطابؓ کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطابؓ ہوتے! (رواہ الترمذی، عن عقبہ بن عامر)۔ تو یہ ہے اجزاء۔

بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر یثرب (مدینہ) سے مکہ آنے والوں میں سے کچھ سعیدہ روحوں کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ اسلام سے مشرف کر دیا، وہ بھی ایک نوعیت کا اجنباء ہے۔ یہ لوگ جاہلیت کے رسم و رواج کے تحت حج اور عمرہ کے لئے مکہ آئے تھے اور کوئی طلب ہدایت اور تلاش حق ان کے پیش نظر نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے قبولِ ایمان کے لئے کھول دیئے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو کر مؤمنین صادقین کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ ان حضرات گرامی کی یہ بیعت ہی یثرب کے مدینۃ النبیؐ بننے اور دارالہجرت قرار پانے کی تمہید بن گئی۔ رضی اللہ عنہم!

ہدایت کا حق دار کون؟

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا ایک قاعدہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو بھی حق کا متلاشی ہوگا، جس کے دل میں بھی اثابت ہوگی اس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کا راستہ ضرور دکھا دے گا اس میں ”پسند“ کا معاملہ نہیں رکھا، بلکہ فرمایا: **يَهْدِي الْغَيِّبُ مَنْ يُنِيبُ** کہ جس میں حق کی ہچی طلب ہو، جو بھی اثابت کی روش اختیار کرے، اس پر ہدایت کی راہ کھول دی جاتی ہے۔ اسی قاعدے کو سورۃ العنکبوت کے آخر میں یوں بیان فرمایا:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا لَنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کہ وہ لوگ جو ہماری راہ میں مشقتیں اٹھاتے ہیں، جن میں حق کی طلب اور جستجو ہوتی ہے تو ہم لازماً ان کے لئے اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے! پس معلوم ہوا کہ جن میں اثابت ہوتی ہے، جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہوتے، جن کے دلوں میں حق کی ہچی طلب ہوتی ہے، جن کی فطرت سلیم ہوتی ہے، جو چاہتے ہیں کہ ان پر حق منکشف ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

شرک کے گھناؤپ اندھیروں، بد سے بد تر نظام اور خراب سے خراب تر ماحول میں بھی ایسی سعید رو میں موجود ہوتی ہیں جن کی قلبی کیفیت کو سورۃ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

وَلَبَّيْنَا لِلَّهِ اسْمًا کہ ہم نے اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی سب سے درخشاں مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرت سلیمہ اور طلب حق کی بنیاد پر صدیق اکبر کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح، حضرت سعید ابن زید، حضرت عبدالرحمن ابن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر ابن العوام اور حضرت سعد ابن ابی وقاص (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں، اسی اثابت الی اللہ کے طفیل سے دولت ایمان سے مالا مال ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ہر دور میں ایسی سعید

روحیں موجود ہوتی ہیں جو حق کی تلاشی ہوتی ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واقعے پر غور کیجئے۔ طلب حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منزلوں پر ٹھہرے اور پھر کس طرح منزل مقصود تک پہنچے۔ اسی طرح طالبان حق کہاں کہاں سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور شرف صحابیت سے مشرف ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاهم اجمعین!!

تفرقہ کا اصل سبب

جیسا کہ پہلی آیت میں بیان ہوا، تمام سابقہ امتوں کو یہ حکم ہوتا رہا ہے کہ ”اَنِ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ لَا تَتَّبِعُوا الْاٰفَاقَ“۔۔۔ کہ دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقہ میں مت پڑو! اب اگلی آیت میں اس کا سبب بیان کیا جا رہا ہے کہ جب دین ایک ہے تو پھر تفرقہ کیوں ہوا؟ یہودیت نے ایک علیحدہ راہ کیوں نکالی اور عیسائیت نے علیحدہ کیوں؟ ہر سلیم العقل انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ تو توحید سے بھی واقف تھے اور وحی، بعثت انبیاء و رسل، انزال کتب سماوی، بعث بعد الموت اور محاسبہ اخروی کے عقائد سے بھی واقف تھے۔ یہ امور ان کے لئے اجنبی نہ تھے۔ ان کے برعکس اہل عرب آتی شمار ہوتے تھے اور وہ ان عقائد سے آگاہ نہ تھے۔ تو پھر اہل کتاب نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کیا، بلکہ اس کی مزاحمت و مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید کیوں ہو گئے؟ اس کا سبب معلوم ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر تفرقہ کے دو اہم سبب ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب حق آئے تو وہ واضح نہ ہو اور دوسرا یہ کہ باہمی رخصت و ضد اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے حق کا انکار کیا جائے اور تفرقہ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اگلی آیت میں قرآن مجید پہلے سبب کی نفی اور دوسرے سبب کا اثبات کر رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْاِلٰهَ الْعِلْمُ بِمَا كَانَتْهُمْ

”اور لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔“

پس معلوم ہوا کہ ان کے تفرقے کا اصل سبب ناواقفیت نہیں بلکہ ان کی ضد اور سرکشی تھا۔ ان کے پاس ”اعلم“ آچکا تھا، یعنی ہدایت ربانی ان کو پہنچ چکی تھی، حق ان پر واضح ہو چکا تھا۔ اور حق تو جب بھی آتا ہے بہت واضح اور مبرہن ہو کر آتا ہے، ”بیّنہ بن کر آتا ہے۔“ سورۃ البینہ میں اس مضمون کو مزید واضح کیا گیا:

وَمَا تَفَرَّقَ الْبَيْنُ أَوْ تَوَالَيْتِ الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ ○

”اور نہیں تفرقہ کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس ”بیتہ“ آچکی تھی۔“

یعنی حق روشن اور مبرہن صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ لہذا تفرقے کا اصل سبب لاعلمی اور ناواقفیت نہیں، بلکہ کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ اس تفرقے کے حقیقی سبب کو ”تَغْيَاثُهُمْ“ کے الفاظ سے واضح کیا گیا کہ اس کا اصل محرک آپس کی ضد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش ہے۔ یا پھر قوی مفادات، قوی تفاخر، گروہی مناصب، ذاتی وجاہت و حشمت، اور دنیوی اغراض و مصالح کی خاطر حق سے اعراض کی روش اختیار کی جاتی ہے۔

اہل کتاب کے علاوہ سردارانِ قریش بھی اسی ضد کے سبب سے آنحضورؐ کی دعوت پر ایمان نہ لائے اور دینِ حق کی راہ میں مزامم رہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال ابو جہل کا وہ قول ہے جو اس نے اس وقت کہا جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمدؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں؟ اس نے جواب میں کہا تھا: نہیں، انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔۔۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنی ہاشم کے مابین ایک خاندانی مسابقت چل رہی تھی۔ بنو ہاشم نے مہمان نوازیاں کیں، ہم نے ان سے بڑھ کر کیں۔ انہوں نے حجاج کو کھانے کھلائے، ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ انہوں نے ضیافت کے لئے اونٹ ذبح کئے، ہم نے ان سے زیادہ تعداد میں کئے۔ اس مسابقت میں اب تک ہم نے ان سے مات نہیں کھائی تھی، لیکن اب اگر ہم محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت مان لیں اور ان کی رسالت کو تسلیم کر لیں تو ہم پر بنی ہاشم کی برتری ابد الابد تک قائم ہو جائے گی!۔۔۔۔۔ چنانچہ اس کی اس بات سے مخالفت اور تفرقہ کا اصل سبب واضح ہوتا ہے۔

یہی معاملہ یہود کا ہوا۔ قرآن مجید کی شہادت یہ ہے کہ: الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ

الزمان کا ظہور ہوگا، اگر حقیقی ہدایت اور حق کی طلب ہے تو وہاں پہنچو اور ان کی بعثت کا انتظار کرو! یثرب اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی اوس و خزرج کے قبیلوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے، اور ہم جب اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے تو تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہودیوں کی یہی دھمکی بیعت عقبہ اولیٰ کا سبب بن گئی، جس کا حوالہ اجساء کی مثالوں کے ضمن میں دیا گیا ہے۔ جب مدینہ کے کچھ لوگ مکہ پہنچے اور ان کو حضورؐ کی دعوتِ نبوت کا علم ہوا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ جلدی کرو اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی آمد کے یہود منتظر بیٹھے ہیں، مبادا وہ ہم سے سبقت لے جائیں۔ اس طرح حضورؐ پر ایمان لانے اور پھر آپؐ کے اعوان و انصار بننے کی سعادت اہل مدینہ کے حصے میں آئی، لیکن یہودی بد بختی آڑے آئی اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہے۔ اس لئے کہ ان کی عزتِ نفس پر یہ چوٹ پڑی کہ نعمتِ نبوت بنی اسرائیل سے چھن گئی اور یہ اعزاز بنی اسماعیل کو حاصل ہو گیا کہ نبی آخر الزمان ان میں مبعوث کئے گئے۔ ان کا یہی تعصب، ضد، ہٹ دھرمی اور نسل برتری کا احساس ان کے پاؤں کی پیڑی بن کر رہ گیا اور محرومی ان کا مقدر ٹھہری۔ اسی لئے فرمایا گیا:

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بِمَا بَيْنَهُمْ

کہ انہوں نے جو تفرقہ و اختلاف کیا تو وہ کسی مخالفی یا ناواقفیت کی بناء پر نہیں، بلکہ ہدایتِ ربانی کے واضح طور پر پہنچ جانے کے بعد محض اپنے نفس کی شرارت و سرکشی اور باہمی ضد کا نتیجہ ہے!

”اجل مسمیٰ“ کا قانون

آگے فرمایا:

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّفُضِيَ سَنَهُمْ

”اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکل چکی تیرے رب کی طرف سے ایک وقت مقرر تک تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا!“

واضح رہے کہ سورۃ الشوریٰ کی سورت ہے، اور یہاں حضورؐ کو قیٰل دی جا رہی ہے کہ آپؐ خاطر جمع رکھئے، اللہ کا فیصلہ آکر رہے گا، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو کر رہے گا۔ لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا، کیونکہ ہر چیز کے انجام کے لئے اللہ کا مقرر کردہ ایک اندازہ اور ضابطہ ہے۔ اس فیصلے کے لئے بھی اللہ کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہے، اور جب تک وہ گزری نہیں آتی تب تک منتظر رہنا پڑے گا!

قرآن کے آئینے میں ہماری تصویر

قرآن حکیم کے بارے میں خود قرآن ہی کے الفاظ ہیں: **فِي مَوْجُودِهِ** کہ اس میں تمہارا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ آیت زیر درس کے اگلے حصے میں قرآن ہمارے سامنے ہماری ہی تصویر پیش کر رہا ہے۔ تو آئیے، آئینہ قرآنی میں اپنی تصویر دیکھئے، اور اگر یہ تصویر بُری نظر آئے تو آئینے کو الزام مت دیجئے کیونکہ آئینہ تو حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ اپنی شکل کو درست کرنے کی فکر کیجئے! فرمایا:

وَإِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِٖ أَلْفَنٌ ۖ وَأَوَّلُ الْكِتَابِ مِنْ بَعْدِهِمْ لَنَنصُرَنَّ رُسُلَهُ

”اور وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ در حقیقت اس

کے بارے میں سخت الجھن میں ڈالنے والے ٹک میں مبتلا ہیں“

اس وقت قرآن کے ساتھ ہمارا جو معاملہ ہے وہ اس آیت کا مصداقِ کامل ہے۔ اور یہ در حقیقت اس بات پر ہمارا ایمان مشتمل ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ قرآن واقعی اللہ کی کتاب ہے، محوِ نہ یہ ناممکن اور محالِ عقلی ہے کہ ایک طرف ہمارا یہ یقین ہو کہ یہ مالکِ ارض و سماء کا کلام ہے جس کے حضور ہمیں پوری زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے حاضر ہونا

ہے اور دوسری طرف ہم اس سے اعراض اور گریز کا طرز عمل بھی روا رکھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں پتہ یقین ہو کہ یہ کتاب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے اور پھر بھی نہ اسے پڑھنے کا ہمارے پاس وقت ہو اور نہ اسے سمجھنے کی ہمیں ضرورت محسوس ہو؟ ہم سب کچھ پڑھیں، انگریزی ادب میں سکار ہو جائیں، دنیا بھر کے علوم و فنون حاصل کر لیں، ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے عمر عزیز کے کئی قیمتی سال صرف کر دیں، لیکن اگر عربی پڑھنے اور قرآن حکیم کو سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو تو یہ دعویٰ کیسے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید پر ہمارا ایمان ہے؟ یہ قرآنی تشفیص ہے جو ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ:

وَإِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ ۝

قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اس کیفیت کے لئے لفظ ”شک“ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ”ریب“ کا لفظ بھی استعمال فرمایا کہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم جس حالت میں مبتلا ہو وہ محض شک کی نہیں، بلکہ تمہارے شکوک میں بہت ہی اضطراب انگیز شبہات بھی ہیں۔ اس لئے کہ تمہاری عملی تصویر اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

رسالت کا ایک اہم تقاضا: دعوت

اگلی آیت آج کی گفتگو کے مرکز و محور اور عمود کی حیثیت کی حامل ہے اور اس پر کافی غور و تدبیر کی ضرورت ہے۔ آیت اپنے حجم کے لحاظ سے بھی طویل ہے اور بہت سے مضامین پر محیط ہے۔ ان میں سے ہر مضمون پر ان شاء اللہ الگ الگ گفتگو بھی ہوگی۔ فرمایا:

لَئِنْ لَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنِّ كِتَابٍ ۖ وَإِذْ يُرْتَلَّىٰ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ رَئِيفٌ ۖ وَرَبُّكُمْ ۖ
لَسْنَا عَمَلْنَا وَلَا تَعْمَلُوا لَكُمْ أَعْمَالًا ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُم ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ
وَاللَّهُ الْعَمِيمُ ۝

رسالت کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اسی (توحید اور دین اسلام) کی دعوت دیتے رہیں، اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ خود بھی (توحید اور دین کے تقاضوں پر) مضبوطی سے قائم رہیں، اور ان (مشرکین و کفار) کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔ اور (ان سے صاف صاف) کہہ دیں کہ میں ہر اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل (کا نظام قائم) کروں۔ اللہ ہی ہمارا مالک اور پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (اس بات پر) کسی حجت (دلیل بازی اور جھگڑے) کی ضرورت نہیں۔ اللہ ایک دن ہم سب کو (میدان حشر میں) جمع کرے گا اور (انجام کار کے لحاظ سے) اسی کی طرف پھر جانا ہے!

یہ آیت مبارکہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کے مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آیت کے آغاز میں آنے والے کلمہ ”قا“ اور ”لام“ غایت نے فلیک سے مل کر اس آیت کا ماسبق کی آیات سے بھی مکمل ربط قائم کر دیا ہے اور اس حکم کا مقصد بھی بیان کر دیا ہے۔ نیز اسے اس پس منظر سے بھی مربوط کر دیا ہے جو اس پوری سورۃ الشوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا، جس کی چند آیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ سورۃ مبارکہ مکی دور کے وسط کی سورتوں میں سے ایک ہے۔ زمانہ نزول کے پس منظر میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے پیش نظر رکھئے۔ مسلمان، بالخصوص نوجوانوں اور غلاموں کے طبقے میں سے ایمان لانے والوں پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر قسم کی اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ یثرب (مدینہ) میں یہودیوں کے مضبوط گڑھ تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان تک بھی پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اور حامل کتاب ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود دعوت حق کو مٹانے کے لئے مشرکین سے ریشہ دو انیاں کر رہے تھے۔ نجران میں نصاریٰ بھی موجود تھے اور ان کی ایک مختصر تعداد مکہ میں بھی موجود تھی۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے اور نصاریٰ نے بھی دین کو بدل دیا تھا۔ انہوں نے شریعت کو ساقط کر دیا تھا اور

حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ قرار دے دیا تھا۔ یہود و نصاریٰ میں واضح اختلاف کے علاوہ ان میں سے ہر گروہ میں کئی کئی فرقے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ مکہ میں قریش اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل (علیٰ نبینا و علیہما السلوٰۃ والسلام) سے منسوب کرتے تھے، لیکن انہوں نے دین ابراہیمی کا حلیہ بگاڑ چھوڑا تھا۔ انہوں نے بیت اللہ شریف کو جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، صنم کدہ بنادیا تھا اور اس میں تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے۔ کعبہ کا طواف عریاں حالت میں کرنے کو بڑی نیکی کا عمل قرار دیتے تھے۔ اخلاقی طور پر رذائل و فحائم کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ اس صورت حال میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: **لِلَّذِیْكَ فَادَعُ وَاسْتَعِمْ کَمَا اٰمَرْتُ**۔۔۔۔۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ **لِلَّذِیْكَ** سے پس منظر بھی مراد ہے اور اس آیت کی طرف بھی اشارہ ہے جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا، یعنی:

فَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصَّیْ بِہُمْ نُوْحًا وَّالَّذِیْ اَوْحٰیْنَا اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہِ اِلَّا اِہْمَ وَّمُؤَسٰی وَحٰسٰی اَنْ اٰتِیُوْا الدِّیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا الْاٰفَہَ

”اس (اللہ) نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقہ میں مت پڑو!“

یہاں پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ **لِلَّذِیْكَ فَادَعُ وَاسْتَعِمْ کَمَا اٰمَرْتُ**۔۔۔۔۔ یعنی میثد امر میں حضورؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ اسی دین کی دعوت دیتے رہیے اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس پر مضبوطی سے جیسے رہیے۔ یہ مشرکین و کفار اسے قبول کریں یا نہ کریں، تصدیق کریں یا تکذیب کریں، منظور کریں یا رد کریں، خواہ گالیاں دیں، پھر ماریں، ایذائیں پہنچائیں اور جان کے دشمن بن جائیں، آپ کے فرض منصبی کے اعتبار سے آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ اسی کی دعوت دیتے رہیں، کیونکہ دین کی دعوت آپ کا فرض منصبی ہے۔ ”وَاسْتَعِمْ کَمَا اٰمَرْتُ“ کے الفاظ میں اس بات کی مزید تاکید کی گئی کہ اس سے آپ ایک انج بھی نہیں ہٹ سکتے، آپ کو اس پر جیسے رہنا ہے، کوئی مصلحت، کوئی مشکل،

کوئی مصیبت، کوئی نقصان، کوئی خطرہ اور کوئی صدمہ اس دعوت سے منحرف ہونے کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتا، کیونکہ آپ اس دعوت پر مامور ہیں، آپ اپنی مرضی سے تو نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کر رہے، آپ نے اپنی سوچ سے تو اس دعوت کا آغاز نہیں کیا۔ یہ دعوت من جانب اللہ ہے۔ آپ اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں، لہذا آپ اس منصب رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں لگے رہیے! — آنحضورؐ کو علی الاعلان دعوت پیش کرنے کا حکم ایک دو ہرے اسلوب سے سورۃ الحج میں بایں الفاظ دیا گیا:

فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ○

”پس (اے نبی!) آپ کو جس (دعوت) کا حکم دیا جا رہا ہے، اس کو ڈکنے کی چوٹ پیش کیجئے اور شرک کرنے والوں کی (مخالفت و مزاحمت کی) بالکل پرواہ نہ کیجئے!“

مصالحانہ رویہ کی ممانعت

آیت زیر درس کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ ”اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔“ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں پھر اس ماحول اور پس منظر کی طرف رجوع کرنا ہو گا جس میں یہ ہدایت دی گئی۔ کئی دور کے قریباً نصف میں ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ جب قریش کے مشرک سرداروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس دعوت کا راستہ روکنے کے لئے ان کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی ہیں اور اس دعوت کو ظلم و تشدد اور ایذا رسانی کے ذریعے سے دباننا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر طرح سے ستا کر دیکھ لیا تھا اور آپؐ کے جاں نثار اہل ایمان پر بھی تشدد کے پہاڑ توڑے تھے۔ جو کچھ حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ بن ارت اور آل یاسرؓ کے ساتھ ہوا اس کا تصور بھی روٹنے کھڑے کر دیتا ہے۔ حضرت بلالؓ کو تہنی دھوپ میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر منہ کے بل گھسیٹا جاتا تھا، لیکن ان کی زبان پر کسی فریاد، کسی فغاں یا کسی آہ و بکا کے بجائے بس آہد، آہد کا کلمہ جاری رہتا۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے ہوئے انگازوں پہ لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، ان کے گوشت کے جلنے اور چربی کے پھلنے سے انکارے ٹھنڈے ہوتے، مگر وہ صبر و ثبات کی چٹان بنے رہے۔ حضرت یاسرؓ

کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا جس سے آپؐ کے جسم کے پرچے اڑ گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سیتہؓ کو ابو جہل لعین نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید کر ڈالا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیا کرتے تھے جس سے دم گھٹنے کے قریب ہو جاتا تھا۔ حضرت معصب بن عمیر کو مادر زاد ننگا کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی والدہ نے بھوک ہڑتال کر دی تھی کہ اگر سعدؓ اپنے آبائی دین پر واپس نہ آیا تو میں بھوکوں مرجاؤں گی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کئی بار اتنا مارا پیٹا جاتا کہ جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دارِ رضا ہم اجمعین۔۔۔۔۔ غرضیکہ اہل ایمان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ کچھ لوگ حضورؐ کی اجازت سے ترک وطن کر کے حبشہ ہجرت کر گئے۔

جب قریش نے یہ دیکھ لیا کہ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے ستانے، تکلیفیں پہنچانے اور ظلم و تشدد کی انتہا کر دینے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی اس دین سے واپس نہیں پلٹا تب انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ اب حضورؐ سے مصالحت کے لئے بات چیت کرنی چاہئے۔ اگر یہ کچھ باتیں ہماری مان لیں اور کچھ ہم ان کی مان لیں تو ہماری ناک بھی نیچی نہیں ہوگی اور ایک مصالحانہ فضا بھی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے کچھ لوگ تو اس طرح کی مصالحت کی ضرورت آنحضورؐ کی دعوت کے آغاز ہی سے محسوس کر رہے تھے اور اس کے لئے کوشش بھی کرتے رہے تھے، جس کی طرف سورہٴ ن (سورۃ النعم) میں اشارہ موجود ہے، جو دعوت کے آغاز کی سورۃ ہے۔ وہاں آنحضورؐ کو ان کی چالوں سے بایں الفاظ مطلع فرمادیا گیا تھا:

فَلَا تُطِيعُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ وَذُو الْأَوْتَادِ هُمْ فَكَذِّهْتُونَ ۝ (آیات ۸، ۹)

”پس (اے نبیؐ) آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ آپ مدامت کریں تو یہ بھی مدامت کا رویہ اختیار کریں۔“

جن لوگوں نے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ سردارانِ قریش کی جانب سے آنحضورؐ کے پاس وقتاً فوقتاً سفارتیں آتی رہی ہیں اور حضورؐ کو مختلف اوقات میں

اس پورے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان الفاظ مبارکہ کی معنویت پوری طرح واضح ہوتی ہے: **لَئِذَا لَکَ لَادْعٌ وَاَسْتَعِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ مُتَّبِعٍ**۔ یعنی اے نبی! آپ اپنی دعوت پر ڈٹے رہیے اور اس دین حق کی طرف بلاتے رہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ مشرکین دام ہم رنگ زمین بچھا کر چاہتے ہیں کہ مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، کچھ لینے اور دینے (Give & Take) کا معاملہ ہو جائے، لیکن آپ کو ان کی خواہشات باطلہ کی پیروی کرنے، اپنی دعوت میں کوئی لچک پیدا کرنے اور اپنے موقف میں کوئی کمزوری ظاہر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ کوئی مانے تو اپنے بھلے کو، نہ مانے تو اس کا وبال بھی اسی کے سر ہے: **وَمَنْ يَشْكُرْ لَنَا نَمَّا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ لَانَ اللّٰہِ غِنٰی حَمِیدٌ** اللہ تعالیٰ بڑا غیور ہے، وہ القصد ہے، وہ الغنی ہے، وہ ستورہ صفات ہے، وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ لوگ اگر اس کا دین صد فی

صد نہیں مانتے تو چلو پچاس فی صد یا کم و بیش پر ہی معاملہ کر لیا جائے۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ **يَا دُخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآلَمَةٍ**۔۔۔۔۔ کہ دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ! اس کے دین کو قبول کرنا ہے تو اسے پورا پورا قبول کرنا ہو گا، اس لئے کہ اللہ کے دین میں باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو گئی تو دین خالص نہ رہے گا اور یوں اللہ کے اس حکم کی خلاف ورزی ہو جائے گی: **أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ** کہ آگاہ ہو جاؤ، دین خالص (اطاعتِ کلی) صرف اللہ کا حق ہے اور **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ** **فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ** یعنی ”(اے نبی! ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی ہے، لہذا آپ اللہ ہی کی بندگی کریں، دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔“ (الزمرہ: ۲)۔۔۔۔۔ حق اور باطل کی آمیزش سے جو مجموعہ بھی وجود میں آئے گا وہ حق نہیں کہلائے گا۔ وہ حقیقت کے اعتبار سے حق نما باطل ہو سکتا ہے، لیکن حق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بقول علامہ اقبال۔

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے، شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!
اس شعر میں بڑی حکیمانہ بات بیان کی گئی ہے۔ چونکہ خالص اور مجرد باطل کا تو وجود قائم رہ ہی نہیں سکتا، لہذا باطل مجبور ہوتا ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لئے حق کا کوئی نہ کوئی جزو اپنے اندر شامل کرے۔ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اس کے حکم کا پابند ہے، لہذا خالص باطل کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ باطل درحقیقت حق و باطل کا ملغوبہ ہوتا ہے اور اس میں حق کا کوئی نہ کوئی جزو شامل ہوتا ہے، جس کی تاثیر سے وہ کچھ نشوونما پاتا ہے۔ اس کی مثال آکاس بیل کی ہے جو کسی ہرے بھرے درخت ہی کے طفیل نشوونما پاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ سے سابقہ پیش آیا تو ان دونوں فریقوں کی بھی یہ کوشش تھی کہ اگر نبی اکرم ان کی خواہشات باطلہ کی پیروی کریں اور ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ بھی کچھ جھکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا: **وَلَوْ تَرَوُنَّ تَرْضَاهُ** **الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ بِتَتَّبِعُهُمْ** (آیت ۱۲۰)۔۔۔۔۔ کہ اے نبی! یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہر گز راضی نہیں ہونگے جب تک آپ ان کے طور طریقوں کی پیروی نہ کریں۔

مشرکین اور اہل کتاب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ حضورؐ اس ضمن میں کسی مصالحت کے لئے قطعاً آمادہ نہیں ہو سکتے، چنانچہ ان کی یہ مصالمانہ پیشکشیں دراصل مخلصانہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ اپنے زیر اثر عوام کو یہ مغالطہ دینے کے لئے ہوتی تھیں کہ ان کی طرف سے تو مصالحت کی کوششیں توازن کے ساتھ جاری ہیں، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے موقف پر بضد ہیں۔

ایمان بالکتاب

قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی آیات میں نہایت اہم مضامین کا احاطہ کر لیتا ہے اور اس طرح کوزے میں سمندر بند ہونے کا محاورہ قرآن حکیم کی ہر آیت پر سوئی صد راست آتا ہے۔ چنانچہ اس آیت مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

وَقُلْ آمَنَّا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَّا كِتَابٌ

”(اے نبی!) ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا!“

آیت کریمہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں بڑے اہم مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں، جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، لہذا صرف اشارات پر اکتفاء کیا جاسکتا ہے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ بر ملا ایمان بالکتاب کا اعلان فرمادیجئے۔ یہاں ”مِنَّا“ کی ترکیب خاص طور سے قابل غور ہے۔ اس طرح اس بات کو واضح کیا جا رہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن ہی کو جو خود آپ پر نازل ہو رہا ہے، ”مِنَّا“ من اللہ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ہر آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا اقرار فرماتے ہیں۔ آپ کا معاملہ ان لوگوں کا سا نہیں جو تفرقہ میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بعض کتابوں کو ماننے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ تمام آسمانی کتب اور صحیفے دراصل ایک ہی کتاب ہدایت کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ پہلی کتابیں بھی حق تھیں، لیکن وہ محفوظ نہ رہیں، محرف ہو گئیں۔ اب ہدایت ربانی کا آخری اور کامل ایڈیشن یہ قرآن مجید ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان بالکتاب کے اقرار و اعلان کا حکم اس شد و مد کے ساتھ کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا جا چکا ہے: وَلَا تَتَّبِعِ أَهْوَاءَهُمْ۔

اُس وقت عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ مشرکین مکہ کا حضورؐ سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ آپؐ کو اس قرآن میں تبدیلی کرنا ہو گا یا کوئی دوسرا قرآن پیش کرنا ہو گا، کیونکہ اس قرآن کا موقف انتہائی سخت ہے اور یہ ہمارے معبودوں کی کامل نفی کرتا ہے جنہیں ہمارے آباء و اجداد صدیوں سے پوجتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کی بات تسلیم کرنے کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کو گمراہ اور کافرو مشرک تسلیم کر لیں۔ لہذا آپؐ قرآن میں تبدیلی اور لچک پیدا کیجئے یا پھر دوسرا قرآن پیش کیجئے۔ سورہ یونس میں یہ مضمون بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ فرمایا:

وَإِذَا تَلَّیٰ عَلَیْہِمْ اٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَدْرُوْنَ لِقَانَا اِنَّتِ بِقُرْآنٍ غَیْرِ ہٰذَا
اَوْ بَدِّلْہٗ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ اِنْ یَقْلٰوْا نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتٰیْعِ الْاَمَانُوْہِیْ اِلٰی
اٰتٰی اَخْلَافِ اِنْ عَصٰیْتُمْ فَاِنَّ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (آیت ۱۵)

”اور جب انہیں ہماری روشن اور بظن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسی میں کچھ رد و بدل کرو! (اے نبیؐ) کہہ دیجئے میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کروں۔ میں تو خود اس کے اتباع پر مجبور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے خود بڑے ہولناک دن کے عذاب کا خوف ہے۔“

یہی بات اختصار لیکن انتہائی جامعیت کیساتھ اس آیت میں بیان فرمائی جا رہی ہے کہ: وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ۝ ”بر ملا کہہ دیجئے کہ میں تو خود یقین محکم رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے کتاب میں سے مجھ پر نازل کیا ہے“

اگر میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوتا تو مجھے اس میں ترمیم و تہنیخ کا اختیار بھی ہوتا۔ اگر یہ میرے اپنے نظریات ہوتے، میرا اپنا پروگرام ہوتا، اپنا پانچ منثور ہوتا جس کو چند لوگوں نے مل جل کر باہمی مشاورت سے بنایا ہوتا تو مصلحت کے پیش نظر اس میں رد و بدل یا تہنیخ و ترمیم کا معاملہ ہو سکتا تھا۔ ہماری سیاسی پارٹیاں تو آئے دن وقتی کامیابی اور مصلحت کی خاطر اپنے بنیادی اصولوں تک میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایک طرف یہ دعویٰ کہ ہمارا

اسلام دشمنوں سے اتحاد کر لیا جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ علی الاعلان کہہ دیجئے کہ میں تو قرآن کا ایک شوشہ تک بدلنے کا مجاز نہیں ہوں میں خود اس کا پابند ہوں جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے جیسا کہ سورہ یونس کے ضمن میں حوالہ دیا جا چکا۔
القرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر بیان کرتا ہے) کے اصول کے پیش نظر سورہ یونس کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے:

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ تُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ نَحْنُ نَذِيرُ الَّذِينَ يَنْهَوْنَ
تَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا يَرْجِيهِمْ فِيهِ مِنَ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (آیت ۳۷)

”اور یہ قرآن وہ چیز ہے ہی نہیں جو اللہ (کی ہدایت) کے بغیر گھڑی جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور ”الکتاب“ کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کائنات کے پروردگار کی طرف سے ہے۔“

نظامِ عدل کا قیام

اس سے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

وَأَمَرْتُ لَا عَدْلَ تَعْنِيكُمْ

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظام) عدل قائم کروں!“
سورہ ہود کے آغاز میں جو زمانہ نزول کے لحاظ سے مکی سورت ہے، یہ اصول بیان ہوا کہ:

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَّا قَامُوا لِصَلَاتِهِمْ لَمْ يَذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا مِمَّا كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

”ا ل ر۔ یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی اس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا دانا اور باخبر ہے۔“

مطلب یہ ہوا کہ نزولِ قرآن کے ابتدائی یعنی مکی دور میں چھوٹی چھوٹی آیات میں وہ بنیادی احکام اور اہل اصول بیان فرمائے گئے جن پر دعوتِ اسلامی اٹھ رہی تھی اور جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے اساسی اور اصولی نکات کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر دعوتِ اسلامی کے تدریجی ارتقاء کے دوران مختلف مراحل میں ان ہی نکات کی شرح و تفصیل کی گئی۔ مثال کے طور پر سورہ المدثر کی ابتدائی آیات پر جو آغازِ وحی کے دور کی آیات ہیں، تدبر کیجئے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

”اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جائیے اور (لوگوں کو ان کے عقائد و

اعمال کے انجام بد سے) خبردار کیجئے“ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کیجئے!“

ان آیات میں سے تیسری آیت (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ) خاص طور سے لائق توجہ ہے۔ تکبیر کا لغوی مطلب کسی کو بڑا کرنا ہے۔ یعنی کسی بالا تر اقتدار کی بالادستی اور کبریائی کا اقرار، اعلان اور قیام اس کی ”تکبیر“ ہے۔ ”تکبیر رب“ کے حکم میں فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے دعوتِ اسلامی کا ہدف مقصود مکمل طور پر موجود ہے، لیکن آگے چل کر اس جدوجہد کے مختلف مراحل میں حسب موقع اس حکم کی تفصیل و تشریح کی گئی۔ جیسے سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف (مدنی دور کی سور) میں اس مفہوم و مدعا کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُنَا هُنَا بِالنَّبِيِّ وَالْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى النَّبِيِّ كُلِّهِ

”وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الٰہی (قرآن مجید) اور دین حق

(نظامِ عدلِ اجتماعی) دے کر تاکہ وہ اس (دین) کو تمام جنسِ دین (نظامِ ہائے

اطاعت) پر غالب کر دے!“

اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۳ میں فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعُوا هُمَ حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَأَتَكُونَ لِنَارٍ

”اور ان (مشرکوں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہنے پائے اور دین

(نظامِ اطاعت) صرف اللہ ہی کا ہو جائے!“

آیت زیر درس میں یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے اجمال کے ساتھ بطور اصول بیان ہوئی ہے جس میں حضورؐ سے بر ملا اعلان کرنے کا کہا گیا کہ آپؐ فرمادیتے کہ:

وَأَمْرٌ لَا أُعَدِلُ بَيْنَكُمْ

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظام) عدل قائم کروں!“

یعنی میں محض واعظ اور مبلغ بن کر نہیں آیا۔ اگر تم اس مخالفے میں مبتلا ہو تو حقیقت نفس الامر سے بہت دور ہو۔۔۔ مجھے تو حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کروں۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور شریعت کے مطابق یہ نظامِ عدل قائم نہیں ہوتا میرا مشن تکمیل نہیں پاتا۔ میں شاہد بھی ہوں، مبشر

و نذیر بھی اور داعی الی الخیر بھی ہوں، مذکر و واعظ، مربی و معرک، معلم و مدرس اور رحمت و رأفت بھی ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس پر بھی مامور ہوں کہ میں عدل و انصاف کا نظام قائم کروں، لوگوں کے مابین موجود ظلم و استحصا ل ختم کروں اور بحیثیت رسول، اللہ کے دین (نظام حیات) کو تمام نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر غالب کروں۔ (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ)

حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہم نے کتاب اللہ سے رہنمائی اور ہدایت طلب کرنا چھوڑ دی، اسے صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنالیا اور اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر احترامِ طاقتوں کی زینت بنادیا تو ہم اس مقصد ہی کو فراموش کر بیٹھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بحث کا امتیازی مقصد اور ختمِ نبوت کا لازمی تقاضا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر نفیس وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم فرمائیں جو ظلم و جور اور تعدی سے پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ اس عادلانہ نظام کا دستور اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرما سکتا ہے جو مالک الملک، احکم الحاکمین اور رب العالمین ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں یہ نظامِ عدل و قسط جزیرہ نمائے عرب کی حد تک قائم فرمادیا اور اپنے بعد یہ فریضہ امت کے سپرد فرمایا۔

نظامِ عدل کی ہمہ گیری

عادلانہ نظام اسی نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کو کہا جاسکتا ہے جو زندگی کے محض ایک جزو سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ انسان کی انفرادی و اجتماعی پوری زندگی پر محیط ہو۔ یہ عدل اعتقادی و نظریاتی بھی ہوگا، یعنی اس کی اساس توحید ہوگی اور یہ ہر قسم کے شرک کی نجاست سے پاک ہوگا۔ یہ نظامِ عبد اور معبود کے مابین صحیح تعلق بھی قائم کرے گا۔ یہ بندے کو بتائے گا کہ اس کے مالک کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ایسی تعلیم و تربیت کرے گا کہ جس کی بدولت وہ دل کی آمادگی، شوق و ذوق اور والمانہ محبت کے ساتھ ان حقوق کی ادائیگی کے لئے ہمہ وقت تیار بلکہ بے قرار رہے گا۔ یہ عدل معاشی میدان میں بھی ہوگا، جیسا کہ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: كَمْ لَكُمْ لَا يَكُونُ فُؤَادُكُمْ إِلَّا خِيفَةً مِّنْكُمْ (آیت ۷) ”تاکہ (مال و اسباب اور دولت) صرف تمہارے تو گمروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہیں!“ لہذا اس نظامِ عدل میں ایسے تمام طور

طریقے استعمال کئے جائیں گے کہ سرمایہ صرف امیروں کے الٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔۔۔ اور یہ عدل معاشرتی میدان میں بھی ہوگا۔ اس نظام عدل میں نہ تو کسی کو نسل و نسب، رنگ و زبان اور وطن و مکان کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل ہوگا اور نہ ہی مال و منال، منصب و وجاہت اور شہرت و حشمت کی بنیاد پر کوئی عز و شرف حاصل ہوگا۔ بلکہ فضیلت و امتیاز کا معیار صرف ”تقویٰ“ ہوگا، از روئے الفاظ قرآنی **إِنَّا أَكْرَمُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ تَقْوَاهُ** کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شرف والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو!۔۔۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہلوا کر کہ **”أَمَرْتُ لَا عَدَلَ بَيْنَكُمْ“** ان تمام امور کا احاطہ کر لیا گیا جو عدل کے مفہوم و مدعا کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی کا نام اقامت دین اور اظہار دین ہے۔ اسی کا حکم حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ علیہم السلام کو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو **”إِنِّي أَقِيمُوا الدِّينَ“** کے الفاظ میں دیا گیا۔۔۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو امتیازی شان ہی یہ مقرر ہوئی کہ وہ اس حکم کی بالفعل تکمیل فرمائیں تاکہ تاقیام قیامت بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہو جائے!

الکتاب والمیزان

میں چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کے اختتام سے قبل اس موقع پر آپ کے سامنے اسی سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت اور سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت کا حوالہ بھی پیش کر دیا جائے جو درحقیقت اسی ارشاد ربانی کی شرح ہے کہ **وَأَمَرْتُ لَا عَدَلَ بَيْنَكُمْ**۔۔۔ چنانچہ سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت کی ابتداء میں فرمایا:

اللَّهُ أَلَيْسَ أَنزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ

”وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن مجید) اور المیزان

(شریعت) نازل فرمائی ہے!“

اور سورۃ الحدید کی ۲۵ویں آیت میں فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ

”بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ

الکتاب اور المیزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہو جائیں!

ان دونوں آیات کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے جتنے بھی رسول مبعوث فرمائے اور جتنی بھی کتابیں نازل فرمائیں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ رسول ان کتاب الہی کے ذریعے وہ المیزان نصب کر دیں جس سے ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آئے جس کی اساس عدل و قسط پر قائم ہو۔ عادلانہ نظام کی صحیح تعبیر کے لئے ”المیزان“ (ترازو) سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو استعمال فرماتے۔ میزان (ترازو) کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو تولتا ہے اور اس کے صحیح وزن کو مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ دین حق در حقیقت ”المیزان“ ہے جس میں ہر ایک کا حق متعین کر دیا گیا ہے۔ اللہ کا دین یہ بتاتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے، کس پر کیا واجب ہے، فرائض کیا ہیں اور حقوق کیا ہیں اور ان کے مابین توازن کس قدر ضروری ہے اور ان کی بالفعل ادائیگی کس طرح سے ہونی ہے۔

اس ”المیزان“ کے قیام اور اس کو بروئے عمل لانے کے لئے قوت نافذہ ضروری ہے اور اس قوت نافذہ (حکومت) کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تابع کر دینا ہی اقامت دین و اظہار دین ہے۔ جب تک یہ فرض انجام نہ دیا جائے یا انجام دینے کی سعی و جہد میں اپنے جسم و جان کی توانائیاں نہ لگائی جائیں اور اپنا مال نہ کھپایا جائے، ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ دین کے حصے بخرے کر دینے اور نظام سیاست و حکومت کو دین سے علیحدہ کر کے محض وعظ و نصیحت اور عبادات و نوافل کے فضائل بیان کر دینے سے دین کا نشا پورا نہیں ہوتا۔

خاتمہ کلام

آگے فرمایا:

اللَّهُمَّ تَوَكَّلْ عَلَيْنَا

”(اے نبیؐ کہہ دو) اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہ تمہارا رب بھی ہے!“

لَنَا أَعْمَلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَلُكُمْ

”ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔“

یعنی میرے اور تمہارے درمیان ایک نزاع اس طرح ختم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ دین سمجھ کر اور حق سمجھ کر پیش کر رہا ہوں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں اور اس کی جزاء میں اپنے رب سے پاؤں گا۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں خود غور کرو، اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، اگر یہ نفس پرستی ہے، بددیانتی ہے تو اس کی جوابدہی تم کو کرنا ہوگی۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ

ہمارے تمہارے درمیان حجت بازی، بحث و تھکیں اور مناظرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَالْبَاطِلُ الْمَيُوسِرُ ○

اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو جمع کرے گا۔ ایک دن وہ آئے گا جس دن تمام معاملات طے ہو جائیں گے اور آخر کار اسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے۔ سارے معاملات وہاں فیصلہ ہونگے کہ کس کی کیا ذمہ داری تھی اور اس نے بالفعل کیا کیا؟ کس کا کیا موقف تھا؟ وہاں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

آخر میں میں چاہتا ہوں کہ ”اَنْ يَّاقُمُوا الْيَقِيْنَ“ کے حکم کو آپ ان اصطلاحات کے ساتھ اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں جو اس سلسلہ تقاریر میں بیان کی گئیں۔ دین کا بنیادی اور اساسی تقاضا اور اس کی پہلی منزل ”عبادت رب“ ہے، جس کا لازمی تقاضا ”فریضہ شہادت علی الناس“ کی ادائیگی ہے، جو دین کی عمارت کی دو سری اور بلند تر منزل ہے۔ جبکہ اس کا حتمی اور تکمیلی تقاضا اور بلند ترین منزل ”اقامت دین“ ہے!!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْعَمَلُ لِلَّهِ وَالْعَالَمِيْنَ ○

اقول قولي هذا واستغفر الله لي ولكم ولسائر المسلمين والمسلمات ○○